بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۵۹ | ۱۰؍جنوری ۲۰۲۲ء مطابق ۶؍جمادی الثانی ۱۴۴۳ھ | شمارہ نمبر ۵

اس شمارے میں

عنوان	مضمون	مصنف	صفحہ
شعروادب	نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی	خواجہ الطاف حسین حالیؒ	۴
اداریہ	اخلاق کی اہمیت عبادت سے بھی زیادہ	شمس الحق ندوی	۵
چراغ راہ	ہندوستان میں مسلمان بچوں کی تعلیمی مسئلہ	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	۶
صحبتے با اہل دل	بچوں کی تعلیم وتربیت میں بڑوں کا کردار	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۱۰
فکروعمل	ایمان وعمل اوران کے تقاضے	مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۱۲
سخن دلپذیر	کلام اہل دل کی تاثیر وسحر آفرینی	مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ	۱۴
حقائق وبصائر	حجاز مقدس اور اندیشوں کے بادل	مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی	۱۸
محاسن اسلام	رواداری وشرافت اسلام کی عطا کردہ تہذیب	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۲۰
یادوں کے چراغ	مولانا مفتی محمد ابراہیم اچھودی رحمہ اللہ	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۲۲
تعارف وتبصرہ	’مولانا ابوالجلال ندویؒ - دیدہ وشنیدہ‘	مولانا عبدالمتین منیری	۲۳
رحمت عالم	حضرت محمدؐ سب کے لیے	مولانا سید آصف ملی ندوی	۲۷
تاریخ وتذکرہ	بی اماں - ایک فراموش شدہ ملی قائد	نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی	۳۰
فقہ وفتاویٰ	سوال وجواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۳۳

سرپرست

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول: شمس الحق ندوی

نائب مدیر: محمود حسن حسنی ندوی

معاون مدیر: محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی ❁ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت: مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❁ مولانا محمد خالد غازی پوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرِتعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT
A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)
IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157
State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہِ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ای میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

TAMEER-E-HAYAT
Tagore Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Ph.:0522-2740406
website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/400	فی شمارہ -/20	ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے۔ 75$

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر =/30₹ جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر اطہر حسین نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعر وادب

نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی

خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم

یہ سنتے ہی تھرا گیا گلہ سارا ● یہ راعی نے للکار کر جب پکارا
کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق ● زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق ● اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
مبرا ہے شرکت سے اس کی خدائی ● نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی
تم اوروں کی مانند دھوکا نہ کھانا ● کسی کو خدا کا نہ بیٹا بنانا
مری حد سے رتبہ نہ میرا بڑھانا ● بڑھا کر بہت تم نہ مجھ کو گھٹانا
سب انساں ہیں واں جس طرح سرفگندہ ● اسی طرح ہوں میں بھی اِک اس کا بندہ
بنانا نہ تربت کو میری صنم تم ● نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم ● کہ بے چارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی ● کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی
اسی طرح دل ان کا ایک اک سے توڑا ● قبلۂ کج سے منہ ان کا موڑا
کہیں ماسوا کا علاقہ نہ چھوڑا ● خداوند سے رشتہ بندوں کا جوڑا

کبھی کے جو پھرتے تھے مالک سے بھاگے
دیے سر جھکا ان کے مالک کے آگے

☆☆☆☆

اداریہ

اخلاق کی اہمیت عبادات سے بھی زیادہ

شمس الحق ندوی

اللہ کے رسول محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اخلاق کی اہمیت کو عبادات سے بھی زیادہ اہم قرار دیا ہے، اخلاق انسانوں کے باہمی حقوق کا نام ہے، اور عبادات اللہ کے حقوق یعنی خدا کے فرائض ہیں، اللہ تعالیٰ جو سارے مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے، اس کی رحمت کا دروازہ اچھے برے کسی پر بند نہیں، اس نے شرک وکفر کے علاوہ ہر گناہ کو اپنے منشا اور ارادہ کے مطابق قابل معافی قرار دیا ہے، مگر بندوں کے حقوق کی معافی اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں نہیں بلکہ ان بندوں کے ہاتھ میں رکھی ہے، جن کے حق میں زیادتی ہوئی ہو، ان پر ظلم کیا گیا ہو، بندوں سے اس رحم کی امید نہیں کی جاسکتی، جو ارحم الراحمین کی ذات سے ہے، لہٰذا اس کی بہت فکر کرنے کی ضرورت ہے، اسی لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس بھائی نے دوسرے بھائی پر ظلم کیا ہو تو اس کو چاہیے کہ اسی دنیا میں وہ اس سے معاف کرالے، ورنہ آخرت میں تاوان ادا کرنے کے لیے کسی کے پاس روپے پیسے نہ ہوں گے، صرف اعمال ہوں گے، لہٰذا ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دے دی جائیں گی، اور نیکیاں ختم ہوجائیں گی، تو مظلوم کے گناہ ظالم کے نامۂ اعمال میں لکھ دیے جائیں گے۔

یہ اتنی اہم وضروری چیز ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرض وفات کے آخری خطبہ میں حاضرین سے کہا کہ اگر کسی پر ہمارا حق ہو تو بتائے، ادا کردوں، چنانچہ ایک صاحب نے اپنے کچھ درہم بتائے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا وہ کیسے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ آپ نے ایک مانگنے والی کو ہم سے دلوایا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو وہ درہم دلوائے، اس لیے حقوق العباد کی فکر رکھنی چاہیے، لیکن اس میں اکثر غفلت کی جاتی ہے، لوگ اس کو اہمیت نہیں دیتے، اور یہ ہے ایسی نازک بات کہ اکثر یہ غلطی ہوتی رہتی ہے، اور لوگ اس پر زیادہ دھیان نہیں دیتے، جب کہ قیامت کے دن ایسا ہوگا کہ کوئی کسی کو ذرا بھی سہارا نہ دے سکے گا، کسی کو کسی دوسرے کا ہوش نہ ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے: ''يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ، لِكُلِّ امْرِءٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيهِ'' . [عبس: ۳۴-۳۷] (اس دن بھائی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا، اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے، ہر شخص اس روز ایک فکر میں ہوگا جو اسے (ہر کسی سے) بے پرواہ کردے گی)۔

جب حقوق العباد کا معاملہ اتنا نازک اور خطرہ کا ہے تو اس کی کس درجہ فکر ہونی چاہیے، یہ زیادہ بتانے اور بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس پر زور دیتے ہوئے ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: خيركم خيركم أخلاقاً (تم میں بہترین آدمی وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں)، سب سے زیادہ ۲۴/گھنٹے کا ساتھ اپنے گھر والوں کا ہوتا ہے، اس لیے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا زیادہ خوبی اور کمال کی بات ہے، اور جن سے کم واسطہ پڑ رہا ہے، ان سے اخلاق برتنا آسان ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خيركم خيركم لأهله وأنا خيركم لأهلي (تم میں بہترین آدمی وہ ہے جو اپنے متعلقین کے ساتھ بہتر سلوک کرے، اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہوں)۔

اسی لیے کسی بھی بھائی کے ساتھ بشاشت ومسکراہٹ کے ساتھ ملنا صدقہ کہلاتا ہے کہ اس کا وہ ثواب ہے جو صدقہ کرنے کا ہوتا ہے، اسی لیے اسلامی تعلیمات میں سلام کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، کہ یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو ہر طرح سلامت رکھے، جب ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی کو دعا دے گا تو اس کا حق مارنا اس کے اوپر ظلم وزیادتی کرنا کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ اسی لیے اسلامی تعلیمات میں صدقہ وخیرات کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

ایک حدیث میں ہے: ''اتقوا النار ولو بشق تمرة'' (جہنم سے بچو چاہے کھجور کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو)، جس معاشرہ میں دوسروں کی مدد کا یہ جذبہ ہوگا، اس میں کسی کا حق مارنا، زیادتی کرنا کیسے ممکن ہوسکتا ہے، اسی لیے اخلاق وحسن سلوک کو ہر پہلو سے اہمیت دی گئی ہے کہ آدمی قیامت کے دن اس آزمائش سے بچ سکے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: أفشوا السلام وأطعموا الطعام ،صلّوا والناس نيام تدخلوا الجنة بسلام (سلام کو پھیلاؤ (رواج دو)، کھانا کھلاؤ، اور جب لوگ سورہے ہوں تو (تہجد) نماز پڑھو، جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہوجاؤ گے)۔ ☆☆☆

چراغ راہ

ہندوستان میں مسلمان بچوں کا تعلیمی مسئلہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

قدیم اور جدید طرز حکومت کا موازنہ

پہلے حکومت ایک محدود ادارہ تھا، جس کا تعلق زیادہ تر ملک کے نظم ونسق، فوج، پولس اور محاصل و مالیات سے ہوتا تھا، زندگی کے بہت سے شعبے اس کے دائرۂ عمل اور دائرۂ اثر سے خارج ہوتے تھے، قوم اپنے نظام تعلیم، تہذیب وتمدن، اخلاق و معاشرت میں آزاد ہوتی تھی، اور اس بارے میں خودمختار تھی کہ وہ ان کا جو سانچہ پسند کرے اختیار کرے یا گذشتہ سانچہ قائم رکھے، اس کا نتیجہ تھا کہ انقلاب سلطنت سے ضروری نہ تھا کہ تعلیم و تہذیب میں کوئی انقلاب آئے، تاتاریوں کے حملہ کی قیامت خیزی ابھی تک دنیا کو یاد ہے، اس نے تمام عالم اسلام کی چولیں ہلادیں، لیکن عالم اسلام کے نظام تعلیم و تہذیب کو نہیں چھیڑا، ہندوستان کے فاتحین اور حکمراں خاندانوں نے یہاں کے نظام تعلیم اور اس کے مختلف عناصر اور قوموں کی تہذیبی و تعلیمی خودمختاری میں بہت کم دخل دیا، یہ طرز حکومت کچھ خوبیاں بھی رکھتا تھا اور کچھ معائب بھی، اس وقت اس کی خوبیوں اور نقائص کا موازنہ مقصود نہیں، لیکن جب سے یورپ میں نئی طرز کی جمہوری حکومت کا آغاز ہوا، یہ سمجھا جانے لگا کہ حکومت محض ایک انتظامی مشین نہیں، بلکہ اس کی حیثیت ایک اتالیق اور مربی منتظم کی ہے، اس کا دائرۂ عمل ملک وقوم کی پوری زندگی پر وسیع، اور اس کے حدود واختیارات زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں، وہ قوم کو تعلیم دینے، تہذیب سکھانے اور اس کی دماغی تربیت کی بھی ذمہ دار ہے، اس طرز فکر کا نتیجہ ہے کہ حکومتیں پورے پورے ملک اور پوری پوری قوم کی تعلیم کا بندوبست کرتی ہیں، اس کے لیے وسائل تعلیم مہیا کرتی ہیں، لاکھوں کی تعداد میں مدارس ومکاتب قائم کرتی ہیں، اور تعلیم کو عام کرنے کی لیے جبری تعلیم کے قانون کا نفاذ کرتی ہیں۔

حکومت درحقیقت ایک اتالیق اور سرپرست کی حیثیت رکھتی ہے

حکومت کا یہ جدید رجحان -جس کی تاریخ ایک صدی سے زیادہ نہیں ہے- ایک بڑا ترقی پسندانہ مبارک رجحان ہے، واقعہ یہ ہے کہ حکومت کو انتظامی، فوجی و مالیاتی دائرے میں محدود کردینا حکومت کا کا ایک جماداتی تخیل اور فرائض حکومت کا نہایت تنگ اور محدود تصور ہے، ایک صحیح اور فرض شناس حکومت درحقیقت ایک اتالیق (Guardian) اور ایک خیر خواہ وشفیق سرپرست (Patron) ہی کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے ان تمام فرائض وخدمات کی انجام دہی کی توقع بجا ہے جو ایک شفیق سرپرست اور ایک مستعد فرض شناس مربی انجام دیتا ہے۔ حکومت کی ایک اہم ترین ذمہ داری ہے کہ اپنے شہریوں کی تعلیم کا انتظام کرے اور ان کو خواندہ وتعلیم یافتہ بنانے کی امکانی جدوجہد کرے، تعلیم کے وسائل و مراکز مہیا کرے اور کوشش کرے کہ ملک میں ایک بھی ناخواندہ اور اور بے شعور انسان نہ رہے، جہاں تک حکومت کے اس بنیادی تخیل کا تعلق ہے، کسی صاحب شعور انسان کو اس سے اختلاف نہیں ہوسکتا۔ صحیح دینی حکومت جس کا نمونہ خلافت راشدہ تھی، اسی بنیادی عقیدہ پر قائم ہوئی کہ حکومت پوری قوم کی اتالیق ہوتی ہے، فرق اتنا ہے کہ خلافت نے اپنے کام کو حرف شناسی اور خواندگی میں محدود نہیں سمجھا تھا اور اس نے کبھی قناعت نہیں کی کہ ساری قوم خواندہ ہوجائے بلکہ قوم کے اخلاقی شعور اور اخلاقی بلوغ کو اپنا منتہائے نظر بنایا، اس طرز حکومت کے ایک معتبر نمائندے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اپنے مشہور تاریخی فقرے میں اس طرز حکومت کی اسی امتیازی خصوصیت کو بیان کیا، جب خالص انتظامی ذہنیت رکھنے والے بعض کارکنان حکومت نے ان کی اصلاحی تجاویز اور جمہور کے دینی رجحان کی وجہ سے حکومت کے مالی خسارے کی شکایات کیں تو انھوں نے اپنے طرز حکومت کی طرف سے یہ کہہ کر مدافعت کی اور اس کو حق بجانب ثابت کیا: ”جن کے ہم قائم مقام ہیں [یعنی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)] وہ تحصیلدار بنا کر دنیا میں نہیں آئے تھے، مصلح اور ہادی بن کر دنیا میں آئے تھے“۔

زیر قدمت ہزار جان است

حکومت کا یہ بنیادی تخیل کہ قوم کی عمومی تعلیم اس کا فرض منصبی ہے، جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں، نہایت قابل قدر اور لائق تحسین اقدام ہے، اس میں کسی شخص کو بھی اختلاف نہیں ہوسکتا، لیکن یہ اقدام جتنا مبارک اور عظیم الشان ہے اس کا راستہ اتنا ہی نازک اور مشکل ہے، اور اس پر چلنے کے لیے بڑی سبک روی اور احتیاط کی ضرورت ہے کہ:

زیر قدمت ہزار جان است

جبری تعلیم: اندیشے اور نقصانات

ایک ایسے ملک میں جہاں مختلف عقائد، مختلف اخلاقی قدروں اور مختلف مذاہب کی قومیں آباد ہوں، تعلیم کا جبری اور عمومی نظام نافذ کرنے کے لیے بڑی وسعت نظر، وسعت قلب اور شدید احتیاط کی ضرورت ہے، ذرا سی بے احتیاطی کم نظری، یا عجلت کی کارفرمائی سے اس کا اندیشہ ہے کہ جن قوموں کو اپنے عقائد جان سے زیادہ عزیز ہیں، ان کی زندگی میں ایک ایسی تلخی اور کوفت اور ایک ایسی ذہنی کشمکش پیدا ہو جائے جو اس ملک کی اخلاقی زندگی کے لیے کسی طرح بھی مفید نہیں، وہ یا تو ایسے نظام تعلیم کا مقاطعہ اپنا دینی فرض سمجھیں یا نہایت بددلی اور ذہنی کشمکش کے ساتھ اس کو قبول کریں، ایک نظام تعلیم کی یہ بہت بڑی ناکامی اور اس کے مرتب کرنے والوں کی بڑی غیر دانشمندی ہے کہ آبادی کی ایک بڑی تعداد اس کا گرمجوشی اور مسرت کے ساتھ استقبال نہ کرے۔

دانشمندانہ طرز عمل

ایسے مختلف المذاہب اور مختلف العقائد ملک کے لیے سب سے زیادہ دانش مندانہ طرز عمل یہ ہے کہ اس ملک میں عمومی و جبری نظام تعلیم کو پوری شدت اور خلوص و دیانتداری کے ساتھ غیر جانبدارانہ اور نامذہبی رکھا جائے، اور اس کو آبادی کے کسی عنصر اور کسی فرقہ کے (خواہ وہ تعداد میں کتنا ہی غالب کیوں نہ ہو) عقائد و مذہبی روایات کا نمائندہ اور وکیل نہ بنایا جائے، ایسا ممکن ہے، اور اس وقت بھی دنیا کے بہت سے ملکوں میں ایسا ہو رہا ہے، خود یورپ و امریکہ میں جہاں مذہبی احساس ہندوستان کی طرح تیز بھی نہیں ہے، اس کا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے، انگریزوں کا دورِ حکومت ہمارے لیے کسی طرح لائق تقلید اور قابل رشک نہیں، لیکن اس بارے میں اس کی مثال دی جاسکتی ہے کہ اس دور میں نصاب کی کتابیں بالکل غیر جانبدارانہ اور نامذہبی ہوتی تھیں، اور ان میں کسی فرقہ یا قوم کی مخصوص چھاپ اور اس کے مذہب کی جھلک نہیں ہوتی تھی، یہی طرز عمل ہندوستان کے لیے ہر زمانہ میں مناسب ہے۔

تعلیم میں اخلاقی عنصر

البتہ اگر اخلاقی عنصر کو تعلیم کا جزو بنانے کا خیال ہے اور اس سے ذہنی اور اخلاقی تربیت حاصل کرنے کے مقصد سے یہ ضروری سمجھا جائے کہ بعض روحانی شخصیتوں، معلمین اخلاق، اور پیشوایان مذہب کا ذکر ہو تو پھر اس کا لحاظ ضروری ہے کہ پوری فراخ دلی کے ساتھ ان ناموروں اور اخلاقی و روحانی شخصیتوں کا تعارف ہو جن کی اخلاقی بلندی، پاکیزہ نفسی، روحانیت، خدمت خلق، سچی خدا پرستی اور انسانیت دوستی ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے، خواہ وہ اپنے عقائد و اعمال کے لحاظ سے کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، ان دو راستوں (ایک کامل غیر جانبداری و نامذہبیت، اور ایک مکمل رواداری و بے تعصبی) کے علاوہ اس ملک کے لیے کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔

حیرت اور مایوسی

اس معیار سے جو ہر طرح عادلانہ اور عاقلانہ ہے، اور جس کی پشت پر اصول تعلیم اور انسانی نفسیات کے دلائل کا ایک دفتر اور تاریخی واقعات اور حقائق کا ایک لشکر ہے، جب ہم اپنی نامذہبی (Secular) ریاست کے نامذہبی نظام تعلیم و نصاب تعلیم کو جانچتے ہیں تو ہم کو بڑی مایوسی اور حیرت ہوتی ہے، ہم کو صاف نظر آتا ہے کہ ان دو راستوں میں سے جو ہندوستان کی نوخیز جمہوری حکومت کے لیے ہر طرح موزوں و مناسب تھے، کوئی راستہ اختیار نہیں کیا گیا، بلکہ ایک تیسرا راستہ اختیار کیا گیا ہے، جو اس ملک کے لیے بھی موزوں نہیں ہے جس نے کبھی بھی نامذہبی ہونے کا اعلان نہ کیا ہو، چہ جائیکہ وہ ملک جو اپنے دستور میں بار بار نامذہبی ہونے کا اعلان کرتا ہے۔

دیومالائی اثرات

ہم ایک طرف نصاب تعلیم کی وہ کتابیں دیکھتے ہیں جن میں صاف صاف اور نمایاں طور پر ایک ہی فرقہ اور ایک ہی عنصر کی مذہبی روایات، تاریخی شخصیات اور قدیم علم الاصنام (دیومالا Mythology) کے اسباق ہیں، ان اسباق میں ان عقائد و تخیلات کو پیش کیا گیا ہے جو کم سے کم مسلمانوں کے بنیادی عقائد (توحید و رسالت) سے صرف یہی نہیں کہ مطابقت نہیں رکھتے، بلکہ ان کی تردید کرتے ہیں، مسلمان بچہ جو ان سرکاری مدارس میں تعلیم پانے پر مجبور اور دوسرے ذرائع تعلیم سے عام حالات میں محروم ہے، تعلیم اور نوشت و خواند کے نام سے ایسے عقائد و تخیلات قبول کرتا ہے جو ان بنیادوں سے متصادم ہیں، جن پر اس کے مذہب کی عمارت قائم ہے، اور جن کا اعتقاداً قبول کر لینا اس کے لیے ذہنی و اعتقادی ارتداد کے مرادف ہے، اگر اس کا ذہن سلیم ان کے قبول کرنے سے انکار کرتا ہے یا اس کے گھر کا ماحول اور تعلیم اس کی تردید کرتی ہے (جس کی موجودہ حالات کے لحاظ سے بہت کم توقع ہے) تو اپنے نصاب کی بے وقعتی اور غیر معقولیت کا قائل ہوتا ہے، اور خود ایک کشمکش اور ذہنی الجھن میں گرفتار ہو جاتا ہے، یہ دونوں نتیجے کسی نظام تعلیم کے لیے اچھے اور قابل قبول نہیں، نہ یہ کہ بچہ جو مدرسے میں اپنے والدین کی امانت ہے، اپنے والدین کے

عقائد اور اپنے مذہب کے بنیادی حقائق سے باغی ہو جائے، نہ یہ کہ وہ تعلیم بھی حاصل کرتا رہے اور اس کی فطرت سلیم اس کے قبول کرنے سے انکار بھی کرتی رہے، اور اس کو وہ بعید از قیاس اور نا قابل فہم بھی معلوم ہوتے رہیں۔

حکومت کی زیر نگرانی تیار کردہ نصاب میں جانبدارانہ طرز عمل

دوسری طرف آپ اردو کی وہ سرکاری کتابیں دیکھیے جو مختلف تعلیمی منزلوں کے لیے تجویز کی گئی ہیں، اور حکومت کے زیر نگرانی تصنیف ہوئی ہیں، ان میں کس طرح صرف ایک فرقے اور ایک مکتب خیال کی نمائندگی کی گئی ہے، اور صرف اس کی روایات، تقریبات اور مذہبی و تاریخی و سیاسی شخصیات (Heroes) کا انتخاب کیا گیا ہے، اور کس طرح دوسرے فرقوں اور جماعتوں (Communities) کی نامور شخصیتوں، قابل ذکر تقریبوں اور زندگی کے اچھے پہلوؤں کو نظر انداز کیا گیا ہے، میں آپ کے سامنے صرف ایک نمونہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

یوپی کے محکمۂ تعلیم نے اردو کی جو بیسک ریڈریں تیار کرائی ہیں، ان میں بزرگوں اور شخصیتوں کے سلسلہ میں صرف شری رام چندر جی، شری کرشن جی، سورداس، تلسی داس، میرا بائی کے متعلق اسباق ہیں، تیرتھوں اور مذہبی مقدسات میں صرف اجودھیا، متھرا، کاشی، پریاگ، گنگا، رامائن کا تذکرہ ہے، تاریخی واقعات میں سے بھرت ملاپ، دھنش یگ پر ہلاد کا انتخاب کیا گیا ہے، رہنماؤں اور لیڈروں میں مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، ایشور چند ودیا ساگر، مدن موہن مالوی تلک، لالہ لاجپت رائے، سردار پٹیل، راجندر پرشاد، سروجنی نائڈو، پنڈت پنت، ٹنڈن جی کا نام ملتا ہے، پورے سلسلہ میں کہیں کسی مسلمان شخصیت، کسی اسلامی تقریب، کسی تاریخی روایت حتی کہ جنگ آزادی کے بھی کسی مسلمان قائد اور رہنما کا تذکرہ نہیں ہے، اگرچہ اس سلسلہ میں منگل پانڈے، تانتیا ٹوپی اور بھگت سنگھ تک کو فراموش نہیں کیا گیا ہے۔

ایک کھلی نا انصافی

میں یہ عرض کروں گا کہ یہ صرف مسلمانوں کے ساتھ نا انصافی نہیں ہے؛ بلکہ ہندوستان کے ساتھ بھی بڑی نا انصافی ہے کہ اس کو خواجہ معین الدین اجمیریؒ جیسے کامل انسان، مخدوم شرف الدین یحییٰ بہاریؒ جیسے خدا شناس، نظام الدین اولیاءؒ جیسے سچے خدا پرست، ناصر الدین محمود جیسے درویش صفت بادشاہ، شیر شاہ سوری جیسے اعلیٰ مدبر و منتظم، امیر خسرو جیسے شاعر خوش نوا و فخر ہندوستان، عبدالرحیم خان خاناں جیسے جامع کمالات انسان، شاہ ولی اللہ دہلویؒ جیسے حکیم و فلسفی، ٹیپو سلطان جیسے غیور و بلند ہمت انسانوں کی پیدائش، اور پرورش کے شرف سے محروم کر دیا جائے، جن کی وجہ سے ہندوستان کا پایہ سارے مشرق اور پورے ایشیا میں بلند ہے، اور بڑے بڑے اہل کمال کا سر عقیدت اس کے آگے خم ہے، یہ نئی نسلوں کے ساتھ بھی نا انصافی ہے کہ ان کو انسانیت کی ان تابناک مثالوں اور ہندوستان کے ان سرمایہ فخر فرزندوں کے نام اور کام سے واقف ہونے کا کوئی موقع نہ دیا جائے، جن کی زندگی صرف اسی ملک کے لیے نہیں، دنیا کے تمام نوجوانوں کے لیے قابل تقلید، اور ان کا کردار انسانی سیرت کی تعمیر اور شخصیت کی تکمیل کے لیے ایک بیش بہا طاقت ہے۔

ایک اہم مسئلہ

نصاب کی یہ نوعیت، نظام تعلیم کا یہ جارحانہ رجحان اور اس کے مرتبین کی یہ کوتاہ نظری مسلمانوں کی قومی زندگی کا سب سے اہم اور دشوار مسئلہ بن گیا ہے، دوسرے معاشی و سیاسی مسائل اس مسئلہ کے مقابلہ میں ہیچ ہیں، مسلمانوں کو جب تک اس کی طرف سے اطمینان نہ ہو کہ ان کی آئندہ نسلیں اسلام پر قائم رہیں گی، اور یہ آپ کو معلوم ہے کہ اسلام کسی قومیت اور نسل کا نام نہیں، وہ عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے، اس وقت تک مسلمان ایک شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا رہیں گے، اور ان کو اپنے مستقبل کی طرف سے وہ اطمینان و سکون حاصل نہیں ہوگا جو اس قوم کے لیے ضروری ہے، جو اپنے ماضی کے اعتبار سے بھی اور اپنی موجودہ صلاحیت اور تعداد کے اعتبار سے بھی اسی ملک کی تعمیر و ترقی کا ایک اہم عنصر ہے، مجھے معلوم ہے اور آپ حضرات بھی بے خبر نہ ہوں گے کہ حساس مسلمانوں کا ایک طبقہ شدید کشمکش میں مبتلا ہے، اسی کشمکش کا نتیجہ وہ تاریخی کنونشن ہے جو تعلیم کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے گذشتہ جنوری میں بمبئی میں منعقد ہوا، اور جس میں سارے ملک سے مسلمانوں کی مختلف الخیال جماعتوں اور اداروں نے شرکت کی، بہت سے مسلمان اس مسئلہ کے حل سے مایوس ہو کر یا مستقبل کی خطرناکی کو دیکھ کر اس ملک کو چھوڑ دینے پر غور کرنے لگے ہیں، اور میرے اور آپ کے لیے یہ کوئی راز کی بات نہیں ہے کہ بہت سے خاندانوں نے محض اسی وجہ سے اس ملک کو خیر باد کہہ دیا، میں اس شکست خوردہ ذہنیت کا سخت مخالف ہوں، اور اس کو مسئلہ کا حل بالکل نہیں سمجھتا، اس کو اس عظیم تعداد کے ساتھ بے وفائی بھی سمجھتا ہوں جس کو اس ملک میں رہنا ہے، لیکن اس سے بہر حال مسلمانوں کی شدت احساس اور تلخی احساس کا اظہار ہوتا ہے، اور ہمیں سنجیدگی کے ساتھ اس واقعہ پر غور کرنا چاہیے۔

خلاف عقل و عدل تعلیمی صورت حال اور اس کا مقابلہ

اس صورت حال کا مقابلہ - جو خلاف عقل بھی

ہے اور خلاف عدل بھی، جو مسلمانوں کے ملی وجود کے لیے بھی خطرہ ہے اور ہندوستان کی سیاسی قوت و عظمت کے لیے بھی- دو طرح سے ممکن ہے، ایک یہ کہ پوری قوت و جرأت کے ساتھ اس کا مطالبہ کیا جائے کہ ہماری نامذہبی ریاست کا نظام تعلیم پوری دیانت داری کے ساتھ نامذہبی ہو، اس نصاب تعلیم سے وہ تمام اجزاء خارج کیے جائیں جو مذہبی اور کسی خاص فرقہ کی تعلیمات و عقائد و تاریخ کی نمائندگی کرتے ہیں، یہ بنیاد ہر طرح معقول و مستحکم ہے، آپ جو اس ملک میں قیام کا فیصلہ کر چکے ہیں، جو یہاں پیدا ہوئے اور یہاں کے شہری ہیں، جو حکومت کے محاصل و مطالبات ادا کرتے ہیں، جن کو حق رائے دہندگی حاصل ہے، جو حکومتوں اور وزارتوں کی تشکیل میں دخیل ہیں، جن کو کوئی حکومت اور کوئی سیاسی پارٹی نظر انداز نہیں کر سکتی، جن کی رائے اور تعداد کا پاسنگ ہر پلڑے کو جھکا سکتا ہے، ان کو تمام خصوصیتوں سے قطع نظر محض ہندوستانی اور شہری ہونے کی بنا پر بھی اس کا حق ہے کہ وہ اس کا مطالبہ کریں کہ اس ملک کا نظام تعلیم اور نصاب تعلیم ان کے بنیادی عقائد اور ان کے مذہبی جذبات و ضروریات کے مطابق ہو یا کم سے کم ان کو مجروح کرنے والا اور ان کو چیلنج کرنے والا نہ ہو، اس مطالبہ میں ہندوستان کے تمام معقولیت پسند عناصر آپ کی تائید کریں گے، اور یہ صورت حال جس میں زیادہ دن باقی رہنے کی صلاحیت نہیں ہے اور جو بالکل غیر طبعی اور خلاف فطرت ہے، جلد تبدیل ہو جائے گی، لیکن اس کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ مسئلہ آپ کی زندگی کا اہم ترین مسئلہ ہے، اور آپ کے لیے مذہبی و روحانی طور پر موت و زندگی کا سوال ہے، اور آپ کے لیے اس کے مقابلہ میں کوئی اور متوازی راستہ نہیں ہے۔

صباحی و مسائی مکاتب کا قیام

دوسرا حل یہ ہے کہ آپ اپنے ان بچوں کی دینی و اخلاقی تعلیم کا خود بھی بندوبست کریں، جو جبری تعلیم کے قانون کے مطابق سرکاری مدارس میں تعلیم پا رہے ہیں، اس کا سہل اور قابل عمل راستہ یہ ہے کہ آپ اس مقام پر جہاں مسلمانوں کی کچھ تعداد آباد ہے، صباحی و مسائی مکاتب و مدارس کا انتظام کریں، جہاں آپ کے بچے سرکاری اسکول جانے سے پہلے ایک آدھ گھنٹہ یا سرکاری اسکول سے آنے کے بعد ایک آدھ گھنٹہ دینی تعلیم حاصل کریں۔

دو طاقتیں

اس سلسلۂ تعلیم کے قیام اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے: ایک عزم کی، دوسرے نظم کی، ان دو طاقتوں سے ہزاروں کی تعداد میں ایسے مکاتب و مدارس قائم ہو سکتے ہیں، وسائل و ذرائع ہر دور میں اور ہر ملک میں انسانی فیصلہ اور عزم کے تابع رہے ہیں، عزم نے ان کو حاصل کیا اور نظم نے ان کو کارآمد اور دوررس بنایا، اب بھی جہاں کہیں یہ دو چیزیں پیدا ہو گئیں ہیں انھوں نے وسائل کو بھی مسخر کر لیا ہے، اور موانع کو بھی مغلوب بنا لیا ہے، میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ کچھ مقامات میں عزم اور نظم نے اس مشکل کو آسان کر کے دکھا دیا ہے، اور بتا دیا ہے کہ ہر مقام پر انھیں دو طاقتوں سے اس مہم کو سر کیا جا سکتا ہے، اور مدارس و مکاتب کا ایک ایسا غیر سرکاری جال بچھایا جا سکتا ہے جس کے ذریعہ ہزاروں بچے اپنے عقائد و فرائض اور دینیات اور اردو کی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک اہم مطالبہ

آپ نے اپنے ایک گمنام کارکن اور سپاہی کو (جس کا دائرۂ عمل جلسوں اور کانفرنسوں سے دور دور رہا ہے) ایک اہم تعلیمی کانفرنس کی صدارت کی عزت بخشی، سپاہی حقیقت پسند اور عملی ہوتا ہے، میں آپ سے آخر میں اسی کا مطالبہ کرتا ہوں کہ آپ اپنے آہنی عزم اور عاقلانہ نظم سے اپنے تعلیمی اور دینی مستقبل کو اس ملک میں محفوظ بنائیں، جہاں آپ نے رہنے کا فیصلہ کیا ہے، اور جس کو آپ کے پیغمبرانہ پیغام کی ضرورت ہے، آپ اپنی متحدہ آواز اور پُر امن لیکن طاقتور احتجاج سے نظام تعلیم کے اس نقص کو دور کریں جو اس ملک کے بنیادی دستور اور سیاسی منشور کے بھی خلاف ہے اور اس ملک کی قدرتی ساخت اور واقعات کے بھی خلاف ہے، آپ مطالبہ کریں کہ وہ نظام تعلیم یا تو خلوص اور دیانت داری کے ساتھ نامذہبی ہو، یا انصاف و رواداری کے ساتھ مذہبی، ان دونوں کے درمیان کوئی راستہ نہیں، دوسرے اپنے عزم و نظم سے صباحی و مسائی مکاتب و مدارس کا جال بچھا دیجیے، اور ہر سرکاری مکتب اور مدرسہ کے ساتھ ایک دینی مدرسہ اور مکتب قائم کیجیے۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ صرف اس ایک اجتماع میں مختلف گاؤں، قصبات اور شہروں سے آئے ہوئے وہ مخلص اور صاحب اثر مسلمان اور اہل علم ہیں کہ اگر وہ تنہا اس کا عزم کر لیں کہ وہ واپس جا کر ایسے مدارس اور مکاتب قائم کریں گے، تو سیکڑوں کی تعداد میں ایسے مدرسے قائم ہو سکتے ہیں، اور جہاں تک اضلاع مشرقی کا تعلق ہے یہ مسئلہ بہت حد تک حل ہو سکتا ہے، میں ان سب بزرگوں اور دوستوں سے عرض کروں گا:

غافل منشیں نہ وقت بازیست
وقت ہنر است و کارسازیست

☆☆☆☆☆

صحبتے با اہل دل

بچوں کی تعلیم و تربیت میں بڑوں کا کردار

افادات مجالس علم و حکمت

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ہمارے معاشرہ کا یہ بہت اہم مسئلہ ہے، عام طور سے والدین اور سرپرست اس طرف توجہ نہیں کرتے اور بچوں کے تعلق سے غفلت برتتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں میں غلط صحبت کی وجہ سے بری عادتیں یا بداخلاقی پروان چڑھتی ہے اور سرپرست اس گمان یا خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ ہمارے بچے پڑھ رہے ہیں، نیکوکار ہیں، اچھی طبیعت کے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس اور ناپسندیدہ ہوتی ہے اور یہ سب بے توجہی اور لاپرواہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

یہ دور ایسا دور ہے کہ اگر اس میں سرپرست بچوں کو وقت نہ دیں یا ان کے حرکات وسکنات، ان کے رہن سہن، ان کے دوست احباب حتی کہ ان کے تنہائی کے اوقات پر نظر نہ رکھیں تو بڑا خطرہ ہے کہ وہ راہ راست سے بھٹک جائیں اور گمراہی کا راستہ اختیار کرلیں اور سرپرستوں کو بھنک تک نہ لگے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے والدین، سرپرست یا اساتذہ بچوں پر مکمل توجہ کے ساتھ ان کے لیے وقت فارغ کریں اور ان سے اس طرح کا تعلق رکھیں جس سے ان کو اپنی بات کہنے میں کوئی حجاب نہ ہو، بچے اپنے والدین سے کسی بات کے کہنے میں خوف محسوس نہ کریں اسی طرح طلبہ اپنے اساتذہ سے سوال کرنے میں جھجک محسوس نہ کریں بلکہ کھل کر وہ اپنے سوالات اور باتوں کو رکھ سکیں۔ بچوں کی تربیت کے تعلق سے ایک اہم چیز یہ ہے کہ بڑے وہ کام نہ کریں جس کام کو وہ اپنے بچوں کے لیے ناپسند کرتے ہیں، اگر والدین چاہتے ہیں کہ بچوں کے اخلاق اچھے ہوں تو والدین کو اپنے اخلاق بہت اچھے کرنے ہوں گے، اگر بچوں کو پنج وقتہ نمازی دیکھنا چاہتے ہیں تو والدین کو تہجد گزار بننا ہوگا، یہ تمام باتیں ماں باپ کے علاوہ اساتذہ کے لیے بھی ہیں، اگر اساتذہ چاہتے ہیں کہ طلبہ میں سنجیدگی، متانت اور مقصدیت پیدا ہو، اور خالص نیت کے ساتھ علم کے حصول میں لگے رہیں تو اساتذہ کو ان صفات سے آراستہ ہونا ہوگا، تدریس میں نیت خالص کرنی ہوگی اور اگر طلبہ کو مطالعہ کی عادت ڈالنی ہے تو اساتذہ کو پہلے مطالعہ کا عادی ہونا پڑے گا۔

دراصل بات یہ ہے کہ بچے اپنے بڑوں سے سیکھتے ہیں، جو کردار واخلاق، صفات، طرز زندگی اور سوچ وفکر بڑوں کی ہوگی وہی تمام چیزیں بچوں میں منتقل ہوں گی، کیونکہ بچے اپنے بڑوں سے سیکھتے ہیں، اب یہ ذمہ داروں کو سوچنا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو کیا سکھانا چاہتے ہیں، کس طرح کے اخلاق سے ان کو آراستہ کرنا چاہتے ہیں۔

ایک استاذ کے لیے کتاب کا پڑھا دینا، نحو وصرف کے مسائل بتا دینا، فقہ کی پیچیدہ گتھیاں سلجھا دینا، یہ بھی اپنی ضرورت کے لحاظ سے مطلوب ہے لیکن استاذ کی شخصیت اس کے اخلاق وکردار کا اثر بھی شاگرد پر پڑتا ہے اور جیسی شخصیت اور فکرمندی استاذ کی ہوتی ہے، وہی تمام اس کی خصوصیات حسب موقع شاگرد میں بھی منتقل ہوتی ہیں، آپ نے سنا ہوگا کہ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شخص اپنے والد پر گیا ہے، اپنے والد کی تمام خصوصیات اس میں موجود ہیں، اسی طرح ایک طالب علم کو کہا جاتا ہے کہ اس میں استاذ کی خصوصیات ہیں، انداز گفتگو، طرز تحریر، طرز القاء، وغیرہ۔

نئی نسل کی شخصیت سازی میں تربیت کے سلسلہ میں انداز تربیت کا اثر بہت پڑتا ہے، حسب موقع سختی اور حسب موقع نرمی اور زیادہ تر موقعوں پر خود اپنے اچھے انداز زندگی کے اثرات واقع ہوتے ہیں اور تعلیم کے قابل توجہ تقاضوں کے لیے سختی کرنا بھی مفید ہوتا ہے، ہم نے ادب کی کتابیں اپنے خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی ہیں، وہ عام اندازِ زندگی میں خود نیک زندگی کے حامل رہے، البتہ تعلیم میں وہ ہمارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتے تھے، عبارت کے سمجھنے میں کوتاہی یا غلط پڑھنے پر بہت خفا ہوتے اور ڈانٹتے تھے، محبت اپنی جگہ لیکن اس معاملہ میں کبھی نرم رویہ نہ رکھتے، یہاں تک کہ ہم استاذ ہوگئے اور انہوں نے میری اصلاح سے کبھی گریز نہ فرمایا، اگر ہم نے کوئی غلطی کی تو اس کی اصلاح فرماتے، ایک مرتبہ کا واقعہ ہے: ہم نے ریڈیو میں نشر کرانے کے لیے ایک تقریر لکھی، مولانا کو

پیش کی تاکہ اصلاح کردیں اس میں کچھ خامی تھی، مولانا غصہ ہوئے اور میری کاپی دور پھینک دی اور کوئی نرمی نہیں کی، لیکن میں اس وقت سیکھ ہی رہا تھا اور نیا نیا استاذ تھا، دیکھئے یہ ہے تربیت کا انداز، وہ میرے باپ کے درجہ میں تھے اور معلم بھی تھے، اسی طرح ایک مرتبہ طالب علمی کے زمانہ میں ہم نے " قال " کا صلہ مِن استعمال کردیا: قلتُ منه، توانہوں نے ہم سے کہا کہ ۵۰ مرتبہ کہو" قلت لہ "، " قلت لــہ " اگر مجھ سے کوئی نیند سے اٹھا کر بھی سوال کرے، تو میں " قلت لہ " ہی کہوں گا، لیکن آج کل یہ سب باتیں فضول سمجھی جاتی ہیں، استاذ اگر ٹوک بھی دے یا ناراضی ظاہر کرے یا درجہ میں ڈانٹ دے تو طالب علم کا کیا ردعمل ہوگا، کس طرح وہ استاذ کے ساتھ پیش آئے گا، کچھ کہا نہیں جا سکتا، اسی وجہ سے ہمارے فارغین سے وہ فائدہ نہیں ہورہا جیسا پہلے کے فارغین سے ہوتا تھا۔

بچوں کی تربیت میں بڑا کردار والدین کا بھی ہے اس لیے کہ اگر بچوں کی گھر میں اخلاقی تربیت ہوجائے، ان میں ادب و شائستگی پیدا ہوجائے اور اچھی صفات کے وہ حامل ہوں تو اس طرح کے معاملات نہ پیش آئیں، جہاں تک علمی تشنگی کی بات ہے وہ اپنے اساتذہ سے دور کرلیں اور اخلاق و کردار اور اصلاح میں کچھ کمی ہوتو وہ بھی اساتذہ سے تعلق اور ان کی سرپرستی میں دور ہوجائے گی، لہٰذا والدین خاص طور پر اپنے بچوں کی تربیت میں سنجیدہ رہیں، کوئی نرم پہلو اختیار نہ کریں، اگر بچوں کی کوتاہیوں اور غلطیوں کو نظر انداز کیا جائے گا، ان کی اصلاح کی فکر نہ ہوگی تو اس کے نتیجہ میں بگاڑ پیدا ہوگا اور بچے نافرمان ہوجائیں گے، اگر والدین نے بچے کے ذرا سا رونے پر اس کی خواہش پوری کردی، تو وہ ہر جائز و ناجائز خواہشات آپ سے پوری کرائے گا اور وہ سمجھ جائے گا کہ ذرا سا رونا پڑے گا اور میرا کام ہوجائے گا، البتہ اس کا بھی خیال رہے کہ بیجا سختی نہ کی جائے کیونکہ بیجا سختی اور بلاوجہ روک ٹوک سے بھی بچے ذہنی و دماغی طور پر متاثر ہوجاتے ہیں اور یہ چیز مستقبل میں نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

(ترتیب: محمد سلمان بجنوری ندوی)

☆☆☆☆☆☆

اخلاق ومعاملات کو درست کرنے کی ضرورت

ایک پہلو جو ہمارے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ یہی وہ پہلو ہے جو دوسروں کے سامنے آتا ہے اور جس سے غیروں کو واسطہ پڑتا ہے اور یہی پہلو ان کو ہم سے قریب بھی کرتا ہے اور یہی پہلو ان کو ہم سے دور بھی کرتا ہے، اور یہ پہلو ہے معاملات اور اخلاق کا، ہمیں اپنے معاملات اور اخلاق کو خاص طور پر درست کرنے کی ضرورت ہے، ہم عبادات تو شریعت کے مطابق انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن معاملات میں ہم اپنی مرضی، رواج، مفاد، مصلحت اور ضرورت کو بنیاد بناتے ہیں۔

اخلاق و معاملات کی اہمیت کا اندازہ آپ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی اس تحریر سے لگا سکتے ہیں: ''یہاں جو لوگ مسلمان ہوئے وہ مسلمان کو دیکھ کر مسلمان ہوئے، انہوں نے خواجہ معین الدین چشتیؒ کو دیکھا تھا، خواجہ معین الدین چشتیؒ قطعاً مصنف نہ تھے، ان حضرات نے تصنیف و تالیف کے ذریعہ اور تقریر و خطابات کے ذریعہ دلوں کو نہیں جیتا، انہوں نے دلوں کو اپنے اخلاق سے جیتا ہے، قربانی اور ایثار سے جیتا، وہ جیت سکتے تھے لیکن ہار مان گئے، غصہ کا اظہار کر سکتے تھے لیکن غصہ پی گئے، گالی کا جواب گالی سے دے سکتے تھے لیکن گالی سن کر خاموش رہے، غریب کو سینے سے لگایا، خود بھوکے رہ کر دوسروں کو پیٹ بھر کے کھلایا، اور آج دیکھ لیجیے کہ ہندوستان میں جن مقامات پر سات سو برس تک، ہزار ہزار برس تک مسلمانوں کی حکومت رہی، وہاں آج تک اقلیت میں ہیں، یوپی، مدھیہ پردیش، بہار اور راجپوتانہ، رہا دلی تو وہ مسلم حکومتوں کا پایہ تخت رہا لیکن اس کے باوجود ان علاقوں میں مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہے، لیکن مسلمان اکثریت میں کہاں ہیں؟ کشمیر میں ہیں، جہاں ایک اللہ کا بندہ سید علی ہمدانیؒ پہنچا، اور سارا کشمیر ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوگیا، اسی طرح بنگال ہے، خاص طور پر مشرقی بنگال سارا کا سارا صوفیائے کرام کے حساب میں ہے''۔

یہی ہمارا پیغام ہے اور یہی ہماری دعوت، اجتماعیت پیدا کریں، جذباتیت سے پرہیز کریں، عبادات کے موقع پر نیتیں درست رکھیں، معاملات کو شریعت کے تابع کریں، اخلاق کو نبوی اخلاق کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کریں، یہی ہمارا سب سے مؤثر ہتھیار اور یہی ہماری سب سے مضبوط ڈھال ہے۔

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی

فکر و عمل

ایمان وعمل اوران کے تقاضے

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

دنیا میں دو قسم کے انسان ہیں: ایک عام انسان اور دوسرا ایمان ویقین کا حامل انسان، عام انسان وہ ہے جو انسانی اعضاء وجوارح رکھتا ہے، کھاتا پیتا ہے، اور اپنی بشری ضروریات پوری کرتا ہے، اور دنیا میں مگن رہتا ہے، اس قسم کے انسان دنیا میں بڑی تعداد میں موجود ہیں، ان کا مطمح نظر دنیا کے اسباب ووسائل کا حصول ہے، اور اس کی لذتوں اور نعمتوں سے لطف اندوزی ہے، قدیم زمانے میں اس تصور کے حامل افراد رہے ہیں، وہ روٹی، کپڑا، مکان کے سلسلہ میں متفکر رہے، اور ان وسائل کے حاصل ہونے کو اپنی زندگی کے لیے اہم کامیابی تصور کرتے تھے، ان کے یہاں آخرت کی فکر بالکل نہیں تھی، وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات سے پورے طور پر نا آشنا تھے، بلکہ اگر کوئی صحیح بتانے والا آجاتا تو اس کا مذاق اڑاتے اور اس پر جملے کستے، اس کے ساتھ نارواسلوک کرتے، اور ”اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا، وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ“ یہی دنیوی زندگی ہے، اسی میں ہم مریں گے اور جئیں گے، اور دوبارہ اٹھائے نہیں جائیں گے، ان کا نعرہ تھا۔

جب انسان نے ابلیسی نظام کے مطابق اس نظریہ کو قبول کرنا شروع کیا تو ابتداء ہی سے اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور رسولوں کا سلسلہ قائم فرمایا، انبیاء کرام نے اپنے وجود سے اطراف واکناف کو منور کیا، اور لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنے، اور اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں نبی بھیجے جانے کا نظام قائم فرمایا، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بڑی تعداد میں انبیاء آئے اور وہ لوگوں کو صحیح راستے پر لاتے رہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد کئی سو سال تک کوئی نبی نہیں آیا، تو دنیا میں اندھیرا چھا گیا، اور ہر طرف ظلمتوں کا بسیرا ہوا، مادیت نے سر اٹھانے شروع کیے، اور ایمان مخالف ہوائیں چلنے لگی۔

بعثت محمدیؐ سے پہلے جاہلی زندگی میں یہی مادی عنصر غالب تھا، اس تصور کے ماننے والے بڑی تعداد میں تھے، بلکہ پورا جزیرۃ العرب مادیت کا دلدادہ ہوگیا تھا، اور یہ تصور دنیا کے دوسرے علاقوں میں پھیل گیا، اور اس کے مطابق لوگوں نے زندگی بسر کرنے شروع کردیے، اللہ تعالیٰ نے عرب وعجم کو اس حالت میں دیکھا تو اس نے شدید ناپسندیدگی کا اظہار کیا، اور ارادہ کیا کہ دنیا کو ہلاک کردیں، لیکن اس کی شان کریمی نے ایک موقع دیے جانے کا فیصلہ کیا، اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں آئے تو آپ نے ابراہیمی شریعت کے کچھ آثار ونقوش پائے، چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبی بنایا، اور ایمان وعمل کی عظیم دولت سے سرفراز فرمایا، اور قرآن کریم کے نزول کے ذریعہ اس سوغات کو پوری انسانیت کے لیے عام کردیا، ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ متصف ہوکر انسانوں کا ایک دوسرا گروہ وجود میں آیا، جو ایمان ویقین کے حامل افراد کا گروہ تھا۔

ایمان نام ہے اللہ رب العزت کے متعلق اس عقیدے کا استحضار کا کہ وہی ساری کائنات کے خالق اور مالک ہیں، وہی بندگی کے لائق اور وہی عبادت کے مستحق ہیں، اور اللہ رب العزت کے تصرف میں پوری کائنات ہے، فرشتوں کو اسی نے پیدا کیا ہے، رسولوں کو اسی نے بھیجا ہے، کتابیں اسی نے نازل کی ہیں، تقدیر کا وہی مالک ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق کو عبادات، اخلاق، معاملات، معاشرت میں تقسیم کیا جاتا ہے، اور وہی عمل صالح کہلاتا ہے۔

عبادات میں سب سے پہلے نماز کا درجہ ہے، اس کے ادا کرنے پر رب کی رضامندی اور نہ ادا کرنے پر سخت ناراضگی کی وعید سنائی گئی ہے، اسی طرح روزہ، اور زکوٰۃ اور حج جیسی عظیم عبادتیں اور عمل صالح ہیں، اخلاقیات میں صداقت، راست گفتاری، جھوٹ سے پرہیز کرنا، بدگمانی، غیبت، استہزاء، بغض وعداوت سے دور رہنا بھی ہے، اسی کے ساتھ والدین کے ساتھ حسن سلوک، ان کی خدمت پر جنت کا وعدہ، اولاد کی تربیت اور تعلیم جیسے دیگر امور ہیں، معاشرت اور معاملات میں تجارت، آپسی لین دین، ایفائے عہد، پردہ کی ضرورت، خرید وفروخت کی حلت اور سود کی حرمت وغیرہ امور ہیں، شراب نوشی سے اجتناب، جوا اور قمار بازی سے دوری معاشرتی زندگی کا اہم حصہ ہیں، نکاح، طلاق، ہبہ، وراثت بھی عمل صالح کے ذیل میں آتے ہیں۔

ایمان اور عمل صالح سے ایک صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے، اسلامی معاشرہ وہ پاکیزہ اور خوبصورت معاشرہ ہے، جہاں ہر آدمی امن و انصاف کے ساتھ زندگی گذارتا ہے، اور وہ انسانیت کا خیر خواہ اور اس کی قدروں کا محافظ ہوتا ہے، اس کا ہر فرد ایثار، قربانی، اور محبت و مودت کا علمبردار ہوتا ہے، آج کل ایسے ہی معاشرہ کی ضرورت ہے، معاشرہ انسانوں کے مجموعہ کا نام ہے، اس کا اعلیٰ نمونہ مدنی معاشرہ ہے، جہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے صحیح اسلامی معاشرہ کا تصور پیش کیا، اس میں ہر شعبۂ حیات کے افراد تھے، لیکن بنیادی فکروں میں وہ افراد ایک دوسرے سے آگے بڑھنے والے تھے، یعنی اللہ کی رضا جوئی اور بندگی، اسلامی معاشرہ کی تعمیری بنیادوں میں قرآن کریم، اور ارکان اسلام (نماز، روزہ، زکوۃ، حج) وغیرہ چیزیں ہیں، ان کی پاسداری سے صحیح معاشرہ وجود میں آئے گا۔

اسلام دین فطرت ہے، اور زندگی کے پہلوؤں پر محیط ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے پوری انسانیت کو عطا فرمایا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ذریعہ سے دنیا میں قائم اختلافات، عداوتوں اور شکر رنجیوں کا خاتمہ کیا، اس دین نے دنیا کو امن دیا، انصاف دیا، سعادت عطا کی، اور اخلاق عالیہ کے زیور سے آراستہ کیا، اور مختصر مدت میں دنیا کے ایک بڑے رقبہ پر بغیر کسی خونریزی اور تشدد کے پھیل گیا، یہ اس کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے کا واضح ثبوت ہے، شروع ہی سے اس دین کو ایسے حاملین ملتے رہے، جو دین وشریعت کے ماہر اور دشمنوں کی دسیسہ کاریوں سے واقف تھے، اس لیے انہوں نے اسلام کے آفاقی پیغام اور اس کی علمی، فکری اور انسانی تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کیا، اور علمی تصنیفات کے ذریعہ اس حقیقت کو دنیا کے سامنے واضح کیا کہ اسلام کسی انسانی ذہن کی پیداوار نہیں، بلکہ اللہ کا اتارا ہوا دین ہے، اس کی نگاہ میں امیر وغریب، شاہ وگدا سب برابر ہیں، ان کے درمیان اصل امتیاز طاعت و معصیت کی بنیاد پر ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا“ (جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا تو اللہ تعالیٰ ان افراد کے ساتھ اس کو جمع فرمائیں گے، جن پر اس نے انعام کیا ہے: انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین، اور ان کی بہترین رفاقت ہے)۔ [النساء:۶۹]

اسلام دشمن طاقتوں نے اس ربانی دین کو تشدد و دہشت گردی کا دین گردانا، اور اس کو اپنے لیے رکاوٹ تصور کیا، اور اس کو از کار رفتہ (Out Of Date) شمار کیا، اور اس پروپیگنڈے کی ہر سطح پر اشاعت کی، اور لوگوں کو یہ باور کرایا کہ دین اسلام قتل و غارت گری پر ابھارتا ہے، اور فتنہ وفساد کا داعی ہے، انہوں نے اس نظریے کے حامل افراد بھی تیار کردیے جو ان کے نظریات وافکار کی ترویج واشاعت میں سرگرم ہیں اور اسلام کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ جبکہ ایمان وعمل صالح کی بنیادیں پوری انسانیت کے لیے ذریعہ نجات ہیں، اور جو بھی ان کو اپنے لیے حرز جاں بنائے گا وہ کامیاب ہوگا۔ اس لیے آج ہمیں ایمان اور اس پر استقامت کی بہت ضرورت ہے، اور اسی کے ذریعہ دعوتی عمل بھی انجام پائے گا اور اس کے نتائج سامنے آئیں گے، ان شاء اللہ۔

(ترجمانی: محمد سفیان، عالیہ رابعہ شریعہ)

☆☆☆☆☆

مجلس صحافت ونشریات کی جدید ودیدہ زیب طباعت
فتاویٰ ندوۃ العلماء (جلد چہارم)
مکمل صفحات: ۴۱۶ قیمت: ۴۰۰؍روپے
مجلس صحافت ونشریات
ٹیگور مارگ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ
موبائل نمبر 9889664104, 9415515578
ای میل: ahmadniyaz7893@gmail.com

سخن دلپذیر

کلامِ اہلِ دل کی تاثیر وسحر آفرینی

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ

ایک حکیم کا قول ہے کہ: ”ادب کے اعتبار سے لوگوں کی تین قسمیں ہیں، اہلِ دنیا کے ادب کا انحصار زیادہ تر فصاحت وبلاغت، علوم اور کلام منظوم کے حفظ پر ہے اور اہلِ دین کے نزدیک ادب کا مقصود ریاضتِ نفس، اعضاء وجوارح کی تادیب، حدودِ الٰہی کی حفاظت اور ترکِ شہوات ہے، البتہ اہلِ تصوف کے نزدیک اس کا مقصود قلب کی پاکیزگی، اسرار الٰہی کی رعایت، عبد ومعبود کے مابین قائم پیمانِ وفا کی پاسداری، اوقات کی حفاظت، بشری خواہشات وتقاضوں کی طرف قلت التفات، طلب میں حسنِ ادب اور حضوری اوقات کا خیال اور مقاماتِ قرب کا استحضار ہے“۔

[رسالۃ المسترشدین، از حارث محاسبی]

قلب کی قسمیں

علامہ ابن قیم جوزیؒ کے نزدیک قلب کی تین قسمیں ہیں، وہ فرماتے ہیں۔

”قلب کی تین حالتیں ہیں:

(۱) قلبِ صحیح (زندہ دل)

(۲) قلب میت (مردہ دل)

(۳) قلب مریض (بیمار دل)

قلبِ صحیح وہ قلبِ سلیم ہے کہ قیامت کے دن اسی بندہ کو نجات حاصل ہوگی جو خدا کے حضور اس کو لے کر حاضر ہوگا، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ”یوم لاینفع مال ولا بنون إلا من أتى اللّٰه بقلب سليم“ (اس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد، مگر ہاں جو اللہ کے پاس قلبِ سلیم لے کر آئے گا)۔ اس لیے قلبِ سلیم وہ قلب ہے جو اللہ کے حق میں ہر قسم کے شرک سے پاک اور محفوظ ہو، اور اس کی تمام تر تگ ودو خالص اللہ کی لیے ہو، ارادت، محبت، توکل، انابت، سرافگندگی، خشیت اور امید کا مرکز ومحور صرف اور صرف اللہ کی ذات ہو۔

قلبِ میت قلبِ صحیح کی ضد ہے، قلب میت وہ ہے جو زندگی سے محروم ہو، جسے اپنے رب کی معرفت حاصل نہ ہو، اس کی عبادت رب کے حکم، اس کی محبت اور مرضی کے مطابق نہ ہو، بلکہ وہ اپنی خواہشات ولذتوں کا اسیر ہو، اگر چہ اس میں اللہ کی ناراضگی اور غضب کیوں نہ ہو، اس کا مقصود محض خواہشات نفس کی تکمیل ہے، خدا کی خوشنودی اور ناراضگی سے اسے سروکار نہیں ہوتا۔

اور قلبِ مریض وہ قلب ہے جس میں زندگی کی رمق تو ہو لیکن اس میں بے شمار امراض واسقام ہوں، اس اعتبار سے ایسے دل میں دو قسم کے مادے ہوتے ہیں، کبھی یہ غالب تو وہ مغلوب اور کبھی اس کے برعکس، اگر ان دونوں عنصر پر اس کو غلبہ حاصل ہو تو وہ قلب ایمان ومحبت، اخلاص وتوکل کا مرکز بن جاتا ہے اور یہی اس کے حق میں آب حیات ہے۔

ایسے قلب میں خواہشات کی محبت، اس کو ہر شئے پر ترجیح، اس کے حصول کا شوق اور تڑپ بھی ہوتی ہے، اسی طرح حسد، کبر ونخوت، تکبر وعناد، دنیا میں حصول اقتدار کے ذریعہ عزت وسربلندی کی محبت کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے اور یہی قلب کے لیے موت وہلاکت کا باعث ہے۔

اس اعتبار سے قلب کی پہلی قسم زندگی، انابت وتواضع، نرمی اور ہوشمندی کی آئینہ دار ہوتی ہے اور دوسری قسم ایک خشک وبے جان شئے کی مانند ہے اور تیسری قسم کو مریض کہہ سکتے ہیں کیونکہ ایسا قلب یا تو سلامتی سے قریب تر ہوگا یا پھر موت وہلاکت کے“۔ [طب القلوب، از علامہ ابن قیم الجوزی، ص: ۳۴-۳۹]

سچے کلام کی تاثیر

قلب سے جو بات نکلتی ہے وہ قلب پر اثر انداز ہوتی ہے اور وہی حقیقی ادب ہے۔ دل کا اثر صرف انسان کے اعمال واخلاق اور سلوک ہی پر نہیں پڑتا، بلکہ علمائے ادب کہتے ہیں کہ اس کا اثر انسان کے کلام پر بھی پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اہل دل کا کلام اس کلام سے جدا ہوتا ہے جو دل سے نہیں نکلتا، جاحظ نے ”البیان والتبیین“ میں عامر بن عبدالقیس کا قول نقل کیا ہے کہ:

”جو بات دل سے نکلتی ہے وہ سیدھے دل میں گھر کر جاتی ہے، اور جو بات صرف زبان سے نکلتی ہے وہ کانوں سے آگے نہیں بڑھتی“، ہر کہ از دل خیزد بر دل ریزد۔

حسن بصریؒ نے ایک بے اثر واعظ کے کلام کو سن کر کہا تھا کہ اے واعظ خشک! یا تو تیرے دل میں کوئی خرابی ہے یا پھر میرے دل میں“۔

[البیان والتبیین، از: علامہ ابو عثمان بن بحر الجاحظ]

اہل دل کا ادب

تاریخ میں ایسے صلحاء اور اہلِ دل علماء کے کلام کا وافر ذخیرہ موجود ہے جو پابندِ شریعت تھے، ان میں خدا کا خوف، محاسبۂ نفس، احتساب زندگی، زہد ورع کی صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں، تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں ان اہل دل علماء کے مواعظ و خطبات کی تاثیر کے واقعات کثرت سے منقول

ہیں کہ ان کے موثر مواعظ نے دل کی قساوتوں کا کتنا موثر علاج کیا اور کس قدر خوبی کے ساتھ ان کو صیقل کیا اور منزہ ومجلی بنایا، یہ الگ بات ہے کہ اہلِ ادب نے عموماً اس جانب توجہ نہیں دی، ان اہل دل علماء اور واعظین میں حضرت ابوسعید حسن بصریؒ کا نام بہت نمایاں ہے، حجاج بن یوسف ثقفی کے ساتھ ان کے بہت سے واقعات اور مواقف کافی مشہور ہیں، ان کے مواعظ کی تاثیر کا عالم یہ تھا کہ عظیم اسلامی شاعر فرزدق جب بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اپنی آوارگی اور اباحیت پسندی سے توبہ کرتا، ایک مرتبہ تو اس نے خود کو ایک ستون سے باندھ لیا اور یہ عہد کیا کہ جب تک قرآن حفظ نہ کرلوں گا یہ بیڑیاں نہ کھولوں گا، اپنی توبہ اور حکایتِ حال کے بیان میں اس کے کئی قصائد بھی ہیں، تراجم وسوانح کی کتابوں میں حضرت حسن بصریؒ کے پراثر مواعظ وخطبات، اور جابر وقاہر سلاطین وامراء کے دلوں میں ان کی تاثیر کے واقعات کثرت سے مذکور ہیں۔

چند مشہور اہل دل

تراجم کی کتابوں میں جن صالحین کے مؤثر خطبات ومواعظ اور حالاتِ زندگی کا تذکرہ ملتا ہے ان میں چند اہم اور نمایاں نام یہ ہیں۔

فضیل ابن عیاضؒ (متوفی ۱۸۷ھ) ابومحفوظ معروف ابن فیروز کرخیؒ (م ۲۰۰ھ) ابوالفیض ذوالنون مصریؒ (متوفی ۲۴۵ھ) حارث محاسبیؒ (متوفی ۲۵۳ھ) ابوالحسن سری ابن مغلس ابن السقطیؒ (متوفی ۲۵۳ھ) ابومحمد سہل ابن عبداللہ تستریؒ (متوفی ۲۸۳ھ) ابوالقاسم جنید ابن محمد ابن جنید بغدادیؒ (متوفی ۲۹۷ھ) احمد ابن محمد ابن سہل ابن عطاءؒ (متوفی ۳۰۹ھ) ابوالقاسم عبدالکریم ابن ہوازن صاحب "الرسالۃ" (متوفی ۴۶۵ھ) حجۃ الاسلام ابوحامد محمد غزالیؒ صاحب "احیاء علوم الدین" (متوفی ۵۰۵ھ) شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (متوفی ۵۶۱ھ) ابوالفرج عبدالرحمٰن ابن جوزیؒ (متوفی ۵۹۷ھ) وغیرہ، ان اہل دل علماء اور صلحاء کے کلام میں عجیب وغریب تاثیر ہے جس کا اثر صدیاں گذرنے کے باوجود آج بھی دلوں میں محسوس ہوتا ہے، ان مواعظ کا امتیاز یہ ہے کہ ان میں نفسِ انسانی کی مختلف کیفیات وواردات، احساسات ووجدانات کا تذکرہ اور ان کا کامیاب علاج موجود ہے، اسی وجہ سے ان مواعظ کے ذریعہ انسانی قلب ووجدان اور شعور پر غیر معمولی اثر پڑتا ہے اور زندگی کا رخ بدل جاتا ہے۔

ہندوستان کے صلحاء

سرزمین ہند بھی ایسے نفوسِ قدسیہ سے محروم نہیں رہی، یہاں بھی اصحاب صدق وصفا کی ایک تعداد بعد کی صدیوں میں پیدا ہوئی، مثلاً شیخ فرید الدین مسعود ایودھنیؒ (متوفی ۶۶۴ھ) شیخ بہاء الدین زکریا ابن محمد ملتانیؒ (متوفی ۶۶۶ھ) شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ (متوفی ۷۵۷ھ) شیخ نظام الدین بدایونیؒ (ولادت ۶۵۶ھ وفات ۷۵۷ھ) امام ربانی شیخ احمد ابن عبدالاحد سرہندیؒ مجدد الف ثانی (متوفی ۱۰۳۴ھ)، امام ربانی کے شیخ، شیخ باقی باللہؒ (متوفی ۱۰۱۵ھ) جو کابل سے ہندوستان وارد ہوئے تھے، ان کا کلام نہایت مؤثر ہوتا، مؤرخین نے لکھا ہے کہ جو بھی ان کی مجلس میں حاضر ہوتا اس کی دل کی دنیا بدل جاتی، امام سرہندیؒ کے رسائل میں بھی عجب تاثیر ہے، ان میں آج بھی وہ قوت واثر ہے جس سے نہاں خانۂ دل میں سوز وساز اور رقت ونرمی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، دلوں کی کشش کی عجیب تاثیر ہے، فنی اعتبار سے ان رسائل کی بہت اہمیت ہے، دیگر ادبی رسائل جو فنِ ادب کی کتابوں میں منقول ہیں، ان میں اتنی قوت وتاثیر نہیں جو شیخ سرہندیؒ کے رسائل میں موجود ہے اس لیے کہ ان رسائل نے اس عہد کی زندگی میں اپنی ساحرانہ تاثیر سے عجیب انقلاب برپا کردیا تھا اور آج بھی ان رسائل سے دلوں کی سرد انگیٹھی میں حرارت اور گرمی پیدا ہوتی ہے، اسی طرح شیخ کے نامور شاگردوں اور مریدین کا بھی ایک طویل سلسلہ ہے جن کے کلام میں اثر آفرینی کی صلاحیت پائی جاتی ہے، مثلاً شیخ آدم بنوریؒ (متوفی ۱۰۵۳ھ)، شیخ محمد معصومؒ (ولادت ۱۰۰۷ھ وفات ۱۰۷۹ھ) اور ان کے اہلِ دل مریدین ومتوسلین میں شیخ الاسلام احمد ابن عبدالرحیم معروف بہ شیخ ولی اللہ دہلویؒ (۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ) اور پھر شاہ صاحب کے مریدین میں شیخ مرزا مظہر جانِ جاناںؒ (ولادت ۱۱۱۱ھ یا ۱۱۱۳ھ وفات ۱۱۹۵ھ) شیخ عبد العزیز دہلویؒ (۱۱۵۹ھ- ۱۲۳۹ھ) کے خطوط، مواعظ اور بیانات میں بڑی دل آویزی اور مقناطیس کی جاذبیت آج بھی پائی جاتی ہے، شیخ عبد العزیز دہلوی نے ادبی اسلوب خصوصاً اردو زبان کی تہذیب وتنقیح اور ترقی میں بڑا رول ادا کیا ہے۔۔

امام حسن بصریؒ کے مواعظ کی تاثیر وبلاغت

امام حسن بصریؒ کے کلام کی اثر آفرینی، حلاوت وچاشنی اور ساحرانہ تاثیر پر علمائے ادب کا اتفاق ہے، امام ادب ابوعمرو بن العلاء حضرت حسن بصریؒ کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ

''میں نے حسن بصری اور حجاج ابن یوسف سے بڑھ کر فصیح اللسان نہیں دیکھا اور حسن بصری حجاج سے زیادہ فصیح ہیں''۔

امام ابوحامد غزالیؒ ''احیاء علوم الدین'' میں رقمطراز ہیں کہ:

''حسن بصری کا کلام انبیاء علیہم الصلوۃ

والسلام کے کلام سے بہت مشابہ تھا اور ان کا طریقہ زندگی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے قریب تر تھا، اس پر سب کا اتفاق ہے، حسن بصریؒ ایک طاقتور اور پرکشش ومحبوب شخصیت کے حامل تھے، لوگ ان کی جادو بیانی کے سامنے مبہوت وششدر رہ جاتے اور بیساختہ ان کی عظمت کے قائل ہوتے، ثابت ابن قرہ ابن زہرون حرانیؒ (۲۲۱ھ - ۲۸۸ھ) کہتے ہیں کہ حسن بصری ایک بحرِ زخار اور دمکتا ہوا آفتاب تھے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تعلق سے ارباب سلطنت کے دربار میں ان کی حق گوئی اور بیباکی کے واقعات بہت مشہور ہیں کہ ان کی زبان حق بیاں یہاں بھی اظہار حق سے باز نہ آئی"۔

حسن بصری اپنے ایک وعظ میں فرماتے ہیں:

"ہائے افسوس! لوگوں کو امیدوں اور خیالی منصوبوں نے غارت کیا، زبانی باتیں ہیں، عمل کا نام ونشان نہیں، علم ہے مگر (اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے) صبر نہیں، ایمان ہے مگر یقین سے خالی، آدمی بہت نظر آتے ہیں مگر دماغ نایاب، آنے جانے والوں کا شور ہے مگر ایک بندہ خدا ایسا نظر نہیں آتا جس سے دل لگے، لوگ داخل ہوئے اور پھر نکل گئے، انھوں نے سب کچھ جان لیا پھر مکر گئے، انہوں نے پہلے حرام کیا پھر اسی کو حلال کرلیا، تمہارا دین کیا ہے؟ زبان کا ایک چٹخارہ! اگر پوچھا جاتا ہے کیا تم روزِ حساب پر یقین رکھتے ہو؟ تو جواب ملتا ہے ہاں ہاں! قسم ہے روز جزا کے مالک کی، غلط کہا، مومن کی شان تو یہ ہے کہ قوی فی الدین ہو، صاحبِ ایمان ویقین ہو، اس کے علم کے لیے حلم اور اس کے حلم کے لیے علم باعثِ زینت ہو"۔

کلام اہل دل کی تاثیر کا راز

صلحاء اور اہل دل کے کلام میں جو غیر معمولی حلاوت، قوت، دل آویزی، تاثیر اور جاذبیت ہے وہ ان کی روح کی لطافت اور قلب کی پاکیزگی، اخلاص وللّٰہیت، حب الٰہی اور عشق نبوی اور اندرونی کیفیت وسرمستی اور سوز دروں کا نتیجہ ہے، اور اس کے لیے وہ کسی خارجی مدد، مقام اور وقت کے محتاج نہیں ہوتے، ان کی خوشی وسرمستی کا سرچشمہ اور ان کی دولت کا خزانہ ان کے دل میں ہوتا ہے، خواجہ میر درد نے جو خود صاحبِ دل اور صاحب درد تھے اس پورے گروہ کی ترجمانی اس شعر میں کی ہے۔

جائیے کس واسطے اے درد میخانے کے بیچ
کچھ عجب مستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ

اندرونی کیفیت اور سوز دروں دلوں کو مسخر کرلیتا ہے، سنگ دلوں کو موم بنادیتا ہے، مولانا جلال الدین رومیؒ کہتے ہیں:

از محبت تلخہا شیریں شود
وز محبت مسہا زریں شود
از محبت دردہا صافی شود
وز محبت دردہا شافی شود
از محبت سجن گلشن می شود
بے محبت روضہ گلخن می شود
از محبت سنگِ روغن می شود
وز محبت موم آہن می شود
از محبت سقم صحت می شود
وز محبت قہر رحمت می شود
از محبت مردہ زندہ می شود
وز محبت شاہ بندہ می شود

ترجمہ: محبت سے تلخی میں مٹھاس وشیرینی پیدا ہوجاتی ہے، محبت مٹی کو سونا بنادیتی ہے، محبت درد والم کو شفا کا پیام اور راحتِ دوام بنادیتی ہے، محبت کی وجہ سے قید خانہ بھی گلشن بن جاتا ہے اور محبت کے بغیر ایک گلشن بھی جہنم کدہ معلوم ہوتا ہے، محبت پتھر کو پانی اور آہن کو موم بنادیتی ہے، محبت سے بیماری صحت میں تبدیل ہوجاتی ہے اور اسی سے قہر عین رحمت بن جاتا ہے، محبت میں وہ قوت ہے جو مردہ کو زندہ کردے اور شاہ کو غلام بنادے۔

فرماتے ہیں کہ:

جسم ِخاک از عشق بر افلاک شد
کوہ در رقص آمد و چالاک شد
عشق جان ِطور آمد عاشقاں
طور مست و خر موسی صعقا

ترجمہ: عشق ومحبت کی وجہ سے جسم خاکی آسمان کے بلندیوں میں پرواز کرنے لگتا ہے، کوہ ودمن میں رقص وسرود کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، وہ زمین کی پستیوں کو پیچھے چھوڑ آسمان کی رفعتوں سے ہم کلام ہوجاتا ہے، ایک ہی جست میں وہ تحت الثری سے ثریا میں پہونچ جاتا ہے۔

ادب میں سوز دروں اور خون جگر کی اہمیت

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ادب وانشاء کے سلسلہ میں عام مؤرخ ونقاد اکثر اس حقیقت کو نظر انداز کردیتے ہیں کہ تحریر کی قوت، کلام کی تاثیر اور قبول عام وبقائے دوام کے لئے سب سے زیادہ معاون عنصر لکھنے والے کی اندرونی کیفیات، اس کا یقین، دلی جذبہ، کسی حقیقت کے اظہار کے لئے اس کی بے چینی وبے قراری ہے، ایسے کسی شخص کو جو اس اندرونی کیفیت سے سرشار اور اس کو دوسروں میں پیدا کرنے کے لئے مضطرب وبے قرار ہو جب قدرت کی طرف سے ذوق سلیم بھی عطا ہو، الفاظ و اسالیب بیان پر ضروری حدتک قدرت بھی حاصل ہو اور اس کی تحریر میں علم وادب، عقل و

استدلال اور حسن بیان کے ساتھ سوز دروں اور خون جگر بھی شامل ہو تو اس کی تحریر میں ایسا اثر اور ایسا زور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں ہزاروں دلوں کو زخمی کرتی ہے اور سیکڑوں برس گزر جانے کے بعد بھی اس کی تازگی اور زندگی اور اس کی تاثیر اور قوت تسخیر قائم رہتی ہے‘‘۔

مفکر اسلام آگے لکھتے ہیں:

’’ناقدین ادب نے وقت، ماحول، فضا اور طبیعت کے فراغ کو ادب و شاعری کے لئے بہت زیادہ ساز گار اور معاون عنصر تسلیم کیا ہے اور بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے اس کا اظہار کیا ہے، کہ لب جو، کنار دریا، گوشۂ چمن، فصل بہار، نسیم سحر، صبح کا سہانا وقت، ان کی شاعری اور ان کے ادب کے لیے محرک بن جاتا ہے، اور ان میں بہت لوگ ایسے مقام کی تلاش اور ایسے وقت کے انتظار میں رہتے ہیں، اس طرح یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی کہ روح کی لطافت اور دماغ کا سکون ادبیات کے لیے بہت معاون ہے‘‘۔

کلامِ اہل دل کی تاثیر کا اصل منبع درحقیقت ان کا صفائے باطن، ریاضت ومجاہدہ، تزکیہ قلب، حرص وہوس کی مخالفت، معاصی اور غفلت سے دلوں کی حفاظت اور ماسوی اللہ سے استغناء ہے۔

مواعظ وملفوظات کی تاثیر

کلام کا مصدر ومنبع اگر ایسے مصلح ومہذب انسان کی زبان ہو جو قلب کی پاکیزگی، فکر کی بلندی، مکروہات ورذائل سے اجتناب، جذبۂ صادق، جذب وانفعال، سوز وگداز کی صفات سے آراستہ ہو اور صرف صاحب قال ہی نہیں؛ بلکہ صاحب حال ہو، تو اس کا کلام براہ راست دل پر اثر انداز ہوتا ہے، تاریخ وسیر کی کتابوں میں ایسے اہلِ دل صالحین کے کلام کی اثر اندازی کے بہت سے واقعات مذکور ہیں، امام احمد ابن عرفان شہیدؒ (۱۲۰۱ھ ـ ۱۲۴۶ھ) کے حالات میں آتا ہے کہ ان کی مجلس میں بڑے بڑے چور، ڈاکو، قاتل اور فاسق وفاجر حاضر ہوتے اور اپنے گناہوں سے تائب ہوتے، کہا جاتا ہے کہ جب وہ شہر کلکتہ وارد ہوئے تو شراب خانوں اور سنیما گھروں میں تالے پڑ گئے۔

ان کے مخلص مریدین کے کلام میں بھی وہی تاثیر تھی، ان اہل دل واعظین کے تذکرہ میں بہت سی کتابیں ہیں، ان صلحاء وعارفین کو وفات پائے زمانہ ہو گیا پر آج بھی ان کے مواعظ و ارشادات میں وہی جدت تاثیر ہے۔

ان حضرات میں جو قوت بیان، فصاحت و بلاغت کے رمز آشنا تھے، انہوں نے خود بھی اپنی تصنیفی یادگار چھوڑی ہیں، اصلاح وتربیت کے باب میں ان کے رسائل بہت اہمیت اور جلالتِ قدر کے حامل ہیں، دینی حلقوں میں ان کی بہت عزت اور بڑا مقام ہے کیونکہ یہ اصلاح وتربیت، دعوت خیر اور اصلاح وارشاد کا بہت بڑا ذریعہ ہیں، بعض کتابیں تو حجم کے اعتبار سے بہت ضخیم اور کئی کئی جلدوں میں ہیں، مثلاً عوارف المعارف، احیاء علوم الدین از امام غزالیؒ اور بعض رسائل کی شکل میں ہیں جیسے رسالہ قشیریہ اور رسالۃ المسترشدین از حارث محاسبیؒ۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ شرح رسالۃ المسترشدین کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:

’’شیخ حارث محاسبی نے اس رسالہ میں بہت قیمتی نصائح، عمدہ ارشادات، موعظتِ تامہ، واضح تنبیہات، مخلصانہ اقوال وتوجیہات کو علم وحکمت اور معانی ومفاہیم سے لبریز جملوں اور دلنشیں اسلوب میں بیان کیا ہے، جن کو بہ آسانی پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے، لیکن قاری کو بھرپور فائدہ تب ہوگا، جب نہایت غور وتدبر کیساتھ ایک ایک جملہ بار بار اتنا پڑھے اور اس میں تدبر کرے کہ وہ یاد ہو جائے اور زبانی دوہرا سکے‘‘۔

علامہ عبدالرحمٰن ابن جوزیؒ صالحین کے کلام کی تاثیر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

’’صلاحِ قلب کے لیے حدیث وفقہ کے اشتغال کو میں اسی وقت مفید سمجھتا جبکہ اس کے ساتھ مواعظ ورقائق اور سیرتِ صالحین پر بھی نظر اور تدبر ہو، کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جن کو کلام منقول کا مقصود حاصل ہے، اور انہوں نے افعال کی حکمی صورت سے نکل کر اذواق وکیفیات کی دنیا تک رسائی حاصل کر لی ہے‘‘۔

فرماتے ہیں کہ:

’’ان مشاہیر میں سے ہر ایک پر میں نے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جن میں ان کے حالات اور آداب واخلاق کا تذکرہ ہے، مثلاً حضرت حسن بصریؒ، سفیان ثوریؒ، ابراہیم ابن ادہمؒ، بشر حافیؒ، احمد ابن حنبلؒ اور معروف کرخیؒ وغیرہ کے حالات میں کتابیں لکھی ہیں‘‘۔[صید الخاطر]

ان کے علاوہ دیگر علماء نے بھی طبقات وتراجم اور سوانح صالحین کے موضوع پر باقاعدہ مبسوط ومفصل کتابیں لکھی ہیں جو دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس مؤثر وجاذبِ قلب ونگاہ صنف کلام کو افسوس کہ ادب میں وہ مقام نہ دیا گیا جس کا وہ مستحق تھا اور وہ اپنی تاثیر وسحر آفرینی، حسن وجمال کے باوجود نقد وادب کا موضوع نہ بن سکا، عالمی رابطہ ادب اسلامی نے شروع ہی سے اس پر توجہ دی ہے اور اس موضوع پر کئی سیمینار منعقد کیے ہیں۔

☆☆☆☆☆

حقائق وبصائر

حجازِ مقدس اور اندیشوں کے بادل

مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی

حجاز مقدس جو ہر مسلمان کے دل کی دھڑکن ہے، جہاں سے دین وایمان ملا اور جس سے ہر ایمان والے کو وہ جذباتی وابستگی ہے جو عین ایمان ہے، جس کی پاسبانی ہر صاحب ایمان کی ذمہ داری ہے، آج سے سو سال پہلے وہاں نظام میں کچھ ایسی ابتری تھی کہ امن مفقود تھا، جہالت وناخواندگی عام ہوگئی تھی، عقائد تک محفوظ نہ تھے اور دور جاہلیت کی بعض رسمیں رواج پا گئی تھیں، اقتصادی حالت اور خراب تھی، طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا، یہ زمانہ شریف مکہ کا تھا اور یہ حکومت خاص طور پر شریف حسین کے دور میں برطانوی اثرات کے تابع ہوگئی تھی، اللہ کا فیصلہ ہوا اور اس نے آل سعود کو اصلاح حال کے لیے کھڑا کیا، سلطان بن عبد العزیز سعود نے ۱۹۲۵ء میں پورے علاقہ پر کنٹرول کیا، امن وامان قائم کیا، اصلاح حال کا کام کیا، ظلم کا ہاتھ روک دیا، حدود شرعیہ کو نافذ کیا اور سادگی اور مساوات کی ایک مثال قائم کی، اس کے ساتھ اقتصادی پریشانیوں کا بھی خاتمہ ہوا، زندگی کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی گئی۔

ملک عبد العزیز کے بعد ان کے جانشینوں نے بھی ان کوششوں کو جاری رکھا، اس میں اتار چڑھاؤ آتے رہے، لیکن کسی نہ کسی طرح گاڑی چلتی رہی، البتہ تیل کی فراوانی نے اسباب عیش پیدا کردیے اور جفاکش قوم کو جب اس سے سابقہ پڑا تو وہ اس کے سیل رواں میں بہنے لگے، پھر امریکہ ویورپ کے روابط نے اس کی رفتار اور تیز کردی اور لوگوں کا سنبھالنا مشکل ہوگیا۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ نے پہلا سفر ۱۹۴۷ء میں کیا تھا، دوسرے سفر میں جو ۱۹۵۰ء میں ہوا، اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر عبد العلی صاحب کو انہوں نے جو خط لکھا ہے اس سے اس کی عکاسی ہوتی ہے، مولانا کے قلم سے یہ جملے نکل گئے، ”تین برسوں میں کھلا ہوا تغیر محسوس ہوتا ہے، بازار سے لے کر لوگوں کے دماغوں تک مغربی تمدن، تجارت ومعاشیات اور افکار وخیالات کے پنجے اور زیادہ گڑ چکے ہیں، جدہ اترتے ہی اس کا احساس ہوتا ہے اور جس قدر حالات سے واقفیت ہوتی ہے، اتنا ہی اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، کوئی نہیں جانتا کہ خوبصورت عربی لباس میں کتنے دل اور دماغ خالص مغربی بن چکے ہیں“۔[مکتوبات: ج ۱/ص ۵۴]

اس کے بعد حالات میں اتار چڑھاؤ آتا رہا، لیکن حکومت کو شریعت کا ترجمان کسی نہ کسی حد تک سمجھا جاتا رہا اور اسی دوران ملک فیصل کو زمام اقتدار ملی، جن کو اتحاد کے علم بردار کے طور پر دیکھا گیا اور جو اپنی صحیح فکر کی وجہ سے امریکہ کی آنکھوں میں کانٹا بنے رہے، بالآخر ان کو شہید کردیا گیا۔

ملک کی ترقی اور عوام کو راحت پہنچانے کے نام پر جدید وسائل تمدن، آلات تفریح اور سعودی عرب کو پڑوسی ممالک کے نقش قدم پر چلانے اور مغربی تہذیب کو اپنانے کے بارے میں پہلے ہی سوچا جا رہا تھا اور اس کی طرف قدم بڑھنے لگے تھے، ملک فیصل کے بعد اس میں اور تیزی آئی اور آہستہ آہستہ مملکت نے امریکہ کے آگے گھٹنے ٹیک دیے، لیکن پھر بھی شریعت کا احترام باقی رہا اور کسی نہ کسی حد تک اس پر عمل بھی ہوتا رہا۔

عراق وکویت کی جنگ کے بعد جب امریکی فوجوں کا وہاں تسلط ہوا، اس کے بعد حالات اور بگڑے اور شکنجہ اور کستا گیا، ملک عبد اللہ کے آنے کے بعد کچھ تبدیلی کی امید تھی، لیکن ان کو بھی مجبور کردیا گیا اور حالات مزید ابتر ہونے لگے، ان کے انتقال کے بعد ملک سلمان جو دینی ذہن رکھتے تھے اور ان کے مزاج میں سادگی بھی تھی، ان سے توقعات وابستہ کرلی گئیں، لیکن بڑی آسانی کے ساتھ ان کو کنارے کردیا گیا اور ان کے فرزند محمد بن سلمان نے زمام اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لی اور اس وقت وہی سیاہ وسفید کے مالک ہیں، ان کی تعلیم گرچہ سعودی عرب میں ہوئی لیکن امریکی دوستوں کی غلط صحبتوں نے ان کو وہاں تک پہنچا دیا جس کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی، انہوں نے بہت تیزی کے ساتھ تبدیلیاں شروع کیں اور مملکت کو اس راستہ پر ڈال دیا جس سے ہر ہر مسلمان کا دل مجروح ہے۔

مسئلہ اب صرف آلات لہو ولعب کا نہیں رہ گیا، اب کھلے عام بے حیائی کے مناظر ہیں، حکومت ان کو آگے بڑھا رہی ہے، افسوس ہے کہ لوگ دیوانہ وار ان پر ٹوٹ رہے ہیں، دعوتی وفکری کاموں پر پابندیاں لگائی جارہی ہیں، مسجدوں

کے منبر سے بجائے انکار منکر کے انکار معروف کا کام بھی ہونے لگا ہے، اسلامی شعائر کا بھی وہ احترام نہ رہا، غیر مسلموں کے لیے بھی اب حدود باقی نہیں رہے، وہ بر سر عام ہر جگہ آجا سکتے ہیں۔

یہی وہ سعودی حکومت ہے جس نے جامعہ اسلامیہ قائم کیا، جس سے دنیا کے مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا، رابطہ عالم اسلامی کی بنیاد ڈالی، جس نے عالمی سطح پر مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی لی، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ دونوں اداروں میں بنیادی طور پر شریک تھے اور بعض میٹنگوں میں وہاں کی آراء کے خلاف حضرت مولانا نے رائے دی اور مولانا کی بات مانی گئی، اس دور میں وہ علماء وہاں موجود تھے جو صاف بات کہتے تھے، ان کا احترام تھا، ان کی بات چلتی تھی، لیکن آج وہ کچھ نہیں، نہ جامعہ اسلامیہ میں وہ بہار ہے، نہ رابطہ عالم اسلامی اپنے کاموں میں آزاد ہے اور نہ علماء کو بولنے کی آزادی ہے، نہ جانے کتنے علماء حق جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیے گئے، سچی بات کا اظہار کرنا مشکل ہوگیا، وہ دینی وفکری کتابیں جنھوں نے دماغوں کو صحیح رخ دیا تھا، لوگوں میں صحیح فکر اور صحیح جذبات پیدا کرنے میں جن کا بڑا کردار تھا، آج ان پر پابندیاں لگادی گئیں، تبلیغی جماعت جو خالص اصلاحی جماعت ہے، جس کا سیاست سے دور دور کا واسطہ نہیں، مسجد کے منبروں سے اس کو برا بھلا کہنے کے احکامات جاری کردیے گئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خالص توحید کا اعلان کرنے والی اور اس کی دعوت دینے والی مملکت آج فلم اسٹاروں کو بلا کر رقص وسرود کی برہنہ محفلوں کی پشت پناہی کرے اور آخری بات یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں کی یادگاریں محفوظ کی جائیں، پھر مدینہ منورہ سے صرف چند سو کلو میٹر کے فاصلہ پر وہ شہر آباد کیا جارہا ہے جس میں کوئی پابندی نہیں، آخر بات کہاں تک پہنچ گئی۔

موجودہ ولی عہد نے بر سر عام اعلان کیا کہ ہم مملکت کو یورپ کا حصہ بنادیں گے اور ہم اس کے لیے پر عزم ہیں، لوگوں کو یورپ جانے کی ضرورت نہیں، وہ تفریح کے لیے سعودی عرب آئیں، وہ مکہ اور مدینہ اور مقامات مقدسہ جہاں حاضری ایمان تازہ کرنے کے لیے اور اللہ کی بندگی کے لیے ہوتی تھی، لوگ وہاں تفریح کے لیے جائیں، یقیناً یہ زبان نبوت سے نکلے ہوئے کلمات ہیں جو پورے ہورہے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: ایک زمانہ میں حال یہ ہوجائے گا کہ مالدار تفریح کے لیے آئیں گے، متوسط طبقہ تجارت کے لیے آئے گا اور غریب مانگنے کے لیے، یہ بات حقیقت بن کر سامنے آرہی ہے اور اس کے راستے ہموار کیے جارہے ہیں۔

یہ وہ صورت حال ہے جس نے عالم اسلام کو بے چین کردیا، ہر طرف سے صدائے احتجاج بلند کی گئی اور مختلف ملکوں کے مقتدر علماء نے اس صورت پر سخت تشویش ظاہر کی، ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ نے مفصل مکتوب سفارت خانہ کے واسطہ سے محمد بن سلمان کو ارسال کیا اور اس میں اپنے کرب کا اظہار کیا اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے حوالہ سے انھی کے اسلوب میں اپنی بات رکھی۔

امریکہ ویورپ سے یہ مرعوبیت اور وہاں کی وہ متعفن تہذیب جو اونچی اونچی عمارتوں اور سفید چمڑیوں میں بڑی دلکش معلوم ہوتی ہے، اس کی جاذبیت نے ذہن ودماغ کو ایسا مسموم کردیا ہے کہ آج وہی ترقی کا معیار ہے۔

وہ تہذیب جو حقیقت میں یورپ کا اگلا ہوا نوالہ ہے، مشرقی قومیں اس کو نگلنے کے لیے تیار ہیں اور وہ مقدس جگہ جہاں سے دنیا کو تہذیب وتمدن کی سوغات ملی، اخلاق ومعاشرت کا وہ قیمتی نظام ملا جس نے دنیا کو ایک نئی سمت بخشی اور انسانوں کو انسانیت کی حقیقت معلوم ہوئی، آج وہ سب کچھ بھلا کر دنیا کی ملمع سازی کا شکار ہورہی ہے، سچی بات یہ ہے کہ:

اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

پوری دنیا اس وقت جن سخت حالات سے گذر رہی ہے اور طبعی طور پر مسلمان سب سے زیادہ متاثر ہیں، اس وقت ضرورت ہے بات کو پوری طرح سمجھنے کی اور حتی الامکان ہر طرح کے انتشار سے بچ کر اصلاح حال کی کوششوں کی اور اپنے دائرہ کار میں جو ہوسکتا ہو، ہر سطح سے اس میں آگے بڑھنے کی، ورنہ دائرے تنگ ہوتے جائیں گے، حالات بگڑتے جائیں گے، آج بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ خود ہمیں اپنی خامیوں کا بھی احساس نہیں، ہر میدان میں اور زندگی کے ہر گوشہ میں اگر کوششیں کی جائیں گی تو کسی نہ کسی صورت میں اس کے اثرات وسیع ہوں گے اور کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کوششوں کی بدولت وہاں تبدیلی کی شکلیں پیدا فرمادے، جو اس وقت ہمارے اختیار سے باہر ہیں: "وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ".

☆☆☆☆☆

محاسن اسلام

رواداری وشرافت - اسلام کی عطا کردہ تہذیب

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

انسان دنیا میں زندگی گذارتا ہے تو اس کے چاروں طرف تمام لوگ اس کے ہم مذہب، ہم عقیدہ، ہم خیال، ہم فکر اور ہم مزاج نہیں ہوتے، اسے ایسے ماحول میں زندگی گذارنی پڑتی ہے جہاں لوگ دشمنی پر کمربستہ ہوتے ہیں اور جان کے دشمن بن جاتے ہیں، اختلاف مذہب ومشرب کو تو برداشت کرنا پڑتا ہے، اختلاف فکروخیال کو انگیز کرنا پڑتا ہے، جس طرح سے گلہائے رنگا رنگ سے زینت چمن ہوتی ہے، اسی طرح سے اختلاف فکر وخیال سے انسانی سماج خوبصورت ہوتا ہے بشرطیکہ اختلاف مخالفت اور خوں ریزی تک نہ پہونچے لیکن اگر لوگ تشدد پر آمادہ ہوجائیں تو وہاں خود حفاظتی کی تدبیر بھی اختیار کرنا ضروری ہے، قانونی کاروائی بھی کی جاتی ہے، اس بات کی تو اجازت ہے بلکہ یہ بات پسندیدہ ہے کہ انسان جس مذہب وعقیدہ کو عزیز رکھتا ہے وہ اس کی تبلیغ بھی کرے، لیکن تشدد اور جارحیت کی کسی حال میں کسی اچھے سماج میں اجازت نہیں ہے، جس سماج میں قتل وغارتگری پر اکسایا جاتا ہے وہ غیر شریفانہ سماج ہوتا ہے۔ دنیا کے تمام لوگ کسی ایک نقطۂ نظر اور نظریہ پر متفق نہیں ہوسکتے ہیں، یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ دنیا کے سارے لوگ ایک مسلک اور مذہب کے پابند ہوجائیں، افہام اور تفہیم، تعلیم اور تلقین کی گنجائش تو ہمیشہ موجود رہے گی، لیکن کسی کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے شخص پر اپنے نظریہ اور خیال کو مسلط کرے، اور محض اختلاف عقیدے کی وجہ سے دوسروں سے بغض وعناد رکھے، اور خوں ریزی کی اپیل کرے، اس لیے تعلقات میں بہتری اور خوش معاملگی اور خوش اخلاقی زندگی گذارنے کے بنیادی اصول ہیں اور یہ اصول سب کے لیے ہیں۔

لیکن انسانی تاریخ میں محض اختلاف فکر وخیال اور اختلاف مذہب اور عقیدہ کی وجہ سے ظلم وتشدد کے واقعات اتنے زیادہ ہیں کہ پوری دنیا کبھی کبھی جانوروں اور درندوں کی دنیا نظر آنے لگتی ہے، دنیا کی تہذیبوں میں رومی تہذیب اور تمدن کا مقام بہت اونچا تھا، لیکن تاریخ میں اسی تہذیب وتمدن کے ماننے والوں کے ایسے واقعات مذکور ہیں کہ انسانیت کی پیشانی بار ندامت سے جھک جاتی ہے، اس تہذیب میں غلاموں اور غیر قوموں کی کوئی عزت نہیں تھی، انھیں درندوں کا لقمہ بنادیا جاتا تھا، دوسری قوموں کے ساتھ ہمیشہ وحشیانہ سلوک کیا جاتا تھا، اور پوری آبادی کو لقمۂ اجل بنا دیا جاتا تھا، رومی تہذیب کے جو ظلم اور سفاکی کے واقعات کتابوں میں مذکور ہیں، ایسے ہی واقعات ایران کی تہذیب کی تاریخ میں بھی پائے جاتے ہیں، خسرو پرویز، دارا، اور نوشیرواں کے واقعات وحشیانہ سلوک سے بھرے ہوئے ہیں، ایران کی تاریخ میں مذکور ہے کہ عرب اسیران جنگ سے انتقام لینے کے لیے ان کے شانوں میں سوراخ کرکے رسیاں پروئی جاتی تھیں، اور سب کو ملا کر باندھا جاتا تھا، یورپ میں افریقہ کے سیاہ فام لوگوں کے ساتھ جو مظالم کیے گئے ہیں وہ یورپ کی تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں، غلامی کا رواج تھا، اور غلاموں کو جانوروں کی طرح فروخت کیا جاتا تھا، رنگ ونسل کی عصبیت پائی جاتی تھی۔

ہندوستان میں جو برہمن تھے، وہ غیر آریہ لوگوں کو ذلیل اور نجس سمجھتے تھے، اور ان کو برابر کا درجہ نہیں دیتے تھے، برہمنوں کا درجہ سب سے اونچا تھا، وہ شودروں کو انسان سمجھنے کے لیے بھی تیار نہیں تھے، آریہ باہر سے آئے تھے، وہ شوردروں کو اپنا رقیب اور دشمن سمجھتے تھے، اور برہمنوں کی کتابوں میں بھی یہ لکھا تھا کہ اپنے دشمنوں کا اچھی طرح قلع قمع کردو تاکہ وہ سر نہ اٹھا سکیں اور ان کو اس طرح مارو جیسے بلی چوہوں کو مارتی ہے اور ایک شودر گستاخی کرے تو اس کی زبان کاٹ لی جائے، ہندوستان کے سماج میں صورت حال کو بدلنے کی اصلاحی تحریکیں بھی اٹھیں، جین مذہب ایسی ہی ایک تحریک تھی، بزور طاقت اس کا خاتمہ کردیا گیا، بودھ مذہب بھی ایسی ہی تحریک تھی برہمن واد نے اسے ملک بدر کردیا۔ دوسرے مذہب کے لوگوں کو برداشت نہ کرنے کی مثالیں آج بھی ختم نہیں ہوئی ہیں۔ قتل عام کی انتہائی غیر شریفانہ اور غیر مہذب باتیں کی جانے لگی ہیں۔ ایسی باتوں کا جواب تحمل سے دیا جانا چاہیے لیکن خود حفاظتی کی تدبیر بھی اختیار کرنی چاہیے اور قانونی چارہ جوئی کے تمام ذرائع اختیار کیے جانے چاہئیں۔

دنیا کی تاریخ میں تمام تہذیبوں میں عدم رواداری اور عدم تحمل کی تکلیف دہ صورت حال موجود تھی، کوئی ایک دوسرے کو برداشت نہیں کرتا تھا، اور شرافت اور انسانیت کا معاملہ شاذ ونادر پیش آتا تھا، عربوں میں معمولی معمولی بات پر جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی تھی، اونٹوں کے چشمہ پر پانی پلانے اور جانور کے چرانے اور گھوڑا آگے نکلنے پر قیامت ٹوٹ پڑتی تھی اور کئی پشتوں تک لڑائی جاری رہتی تھی

اورانتقام کی آگ اس وقت تک نہیں بجھتی تھی جب تک کہ دونوں متحارب قبیلے تباہ وبرباد نہ ہوجائیں۔ عربوں کی مشہورلڑائی حرب بسوس تھی، جو بنی تغلب اور بنی بکر کے درمیان تھی، چالیس سال تک جاری رہی، بات اتنی معمولی تھی کہ بنی بکر کی اونٹنی بنی تغلب کی چراہ گاہ میں گھس آئی تھی، بنی تغلب کے ایک شخص نے جس کا نام کلیب تھا، غصہ میں آکر ایک تیر مارا جو اونٹنی کے تھن میں جا کر لگا، اونٹنی کے مالک نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو آواز دی، پھر دونوں قبیلوں میں ایسی جنگ چھڑ گئی کہ جب تک دونوں تباہ نہیں ہوگئے تلواریں نیام میں نہیں گئیں، اسی طرح سے ایک جنگ جو حرب فجار کے نام سے مشہور ہے ایک معمولی بات پر دو قبیلوں کے درمیان شروع ہوئی، جس میں سیکڑوں انسانوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ تاریخ میں دنیا کی مختلف تہذیبوں میں جنون اور ہسٹیریا کے دورے پڑتے رہے ہیں اور کوئی زمانہ اس سے خالی نہیں گیا ہے۔

جنگ وجدال اور عدم رواداری کا ماحول جو اس وقت ہے، پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا، کیا روم اور کیا ایران، کیا عرب اور کیا عجم، اور کیا ہندوستان، ہر طرف خوں ریزی اور مزاجوں کی بے اعتدالی پائی جاتی تھی، یہ اسلام تھا جس نے پوری دنیا کو رواداری، انصاف، شرافت کا درس دیا، ساری خرابی اپنے آپ کو سب سے بہتر اور اعلیٰ سمجھنے کی وجہ سے پیش آتی ہے، اسلام نے یہ درس دیا تھا کہ: "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ" [الحجرات:۱۳] یعنی تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ اسلام نے حکم دیا کہ: " لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" یعنی دین میں کوئی زبردستی نہیں، کسی کو زبردستی اپنا مذہب دوسرے پر مسلط کرنے کا حق نہیں ہے، یہ انسان کی اپنی پسند کا معاملہ ہے، مسلمانوں نے کہیں بھی زبردستی کسی کو مسلمان نہیں بنایا، اسلام نے دنیا کو مذہبی آزادی عطا کی، اختلاف خیال کا حق دیا، عورتوں کو ان کے حقوق دیے، جمہوریت اور سیکولرازم کی بہت سی قدریں ہیں جنہیں پہلی بار دنیا میں اسلام نے متعارف کیا اور دنیا کو ان قدروں کا تحفہ دیا، اسلام نے رنگ، نسل زبان، وطن، قومیت، ہر قسم کے تعصب کا خاتمہ کردیا، اور اعلان کردیا کہ: "اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ" [ممتحنہ:۸] یعنی اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، غلطیاں مسلمانوں سے سرزد ہوی ہیں۔ لیکن اسلام کا موقف بالکل صاف اور واضح ہے۔ اسلامی اقدار اور انسانی کردار کے نمونوں کو دنیا والوں کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلام نے حسن سلوک کا عام حکم دیا، نیکی اور غم خواری، ہمدردی، سیر چشمی سخاوت اور فیاضی اور ایثار اعلیٰ ظرفی کی قدروں کو دنیا میں عام کیا اور مجموعی طور پر شریفانہ انسانی اقدار کی ایسی بارش کی کہ خدا کی زمین جل تھل ہوگئی:

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

☆☆☆☆☆

دعائے مغفرت

☆ مولانا محمد غفران ندوی ناظر شعبۂ دعوت وارشاد ندوۃ العلماء لکھنؤ کے بڑے بھائی جناب سید محمد اسلم کا ۱۴/ رجمادی الاول ۱۴۴۳ھ/ ۱۹/ دسمبر ۲۰۲۱ء بروز اتوار بعد نماز مغرب اپنے وطن جوراس میں انتقال ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ انتقال سے دوروز قبل لکھنؤ لائے گئے، جسمانی کمزوری اور ضعف شدید تھا، سادہ مزاج اور دیندار فرد تھے، نماز روزہ کے پابند اور رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف مسلسل کرتے تھے، وہ علماء واہل دین کے قدرداں اور علاقہ میں مسلم وغیر مسلم عوام سے ان کا بہت زیادہ ربط تھا، ہر شخص کے دکھ درد میں شریک ہوتے، مریض کو ڈاکٹر اور ہسپتال تک پہنچانا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔

جوراس، بارہ بنکی میں ہی نماز جنازہ وتدفین ہوئی، بڑی تعداد میں علماء وحفاظ اور اہل تعلق نے قریب ودور سے شرکت کی، مرحوم کے حسن اخلاق کا تذکرہ لوگوں کی زبان پر تھا، وہ تقریباً ۴۰/ برس تک ایک مقامی جونیئر ہائی اسکول کے منیجر رہے، اور تعلیم وتربیت کے تئیں اچھا کام کیا۔

☆ مفتی منور سلطان ندوی رفیق علمی مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کی والدہ ماجدہ ایک طویل علالت کے بعد ۲۵/ رجمادی الاول ۱۴۴۳ھ مطابق ۳۰/ دسمبر ۲۰۲۱ء بروز جمعرات قبل نماز ظہر اپنے وطن ہی میں اللہ کو پیاری ہوگئیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

نماز جنازہ مرحومہ کے چھوٹے فرزند مفتی منور سلطان ندوی نے پڑھائی اور اپنے آبائی وطن بشنو پور، ضلع مدھوبنی بہار کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی، مرحومہ بڑی نیک دل خاتون تھیں، لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہونا اور رشتہ داروں کی ضرورت کو پورا کرنا ان کی خاص صفت تھی، خاندان کے تمام بچے اور بچیوں کی تعلیم وتربیت میں انہوں نے بڑا کردار ادا کیا، جس کے نتیجے میں متعدد بچے حافظ وعالم بنے، اور کئی معیاری عصری تعلیم کے حصول میں لگے ہوئے ہیں، پھیپھڑے کی خرابی کی وجہ سے گذشتہ پانچ برسوں سے آکسیجن پر تھیں، اللہ تعالیٰ نے حج کی توفیق سے نوازا تھا، پسماندگان میں شوہر کے علاوہ دولڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔

اللہ تعالیٰ مرحوم ومرحومہ کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں مقام عطا کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل دے، آمین۔ قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ ☆☆☆

یادوں کے چراغ

مولانا مفتی محمد ابراہیم اچھودی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ادھر دوسال کے اندر بڑی قیمتی اور ممتاز شخصیات دنیا سے رخصت ہوئیں، اورامت کو بڑے خسارے کا احساس ہوا، زندگیوں کی تعداد مقدر کے ساتھ اللہ رب العزت کی طرف سے طے ہے، اوراسی کے مطابق گذرتی ہے، کسی کو کم مدت کسی کو زیادہ مدت اللہ رب العزت کی طرف سے مقرر کی گئی ہے اوراس میں صبر کی تلقین کی گئی ہے، سارے انسانوں کی زندگیاں صبرو شکر کے درمیان چلتی ہیں اوراس طرح انسان کا امتحان ہوتا رہتا ہے ، انہی شخصیات میں صاحب تقویٰ و اخلاص بزرگ مولانا مفتی محمد ابراہیم کی شخصیت بھی ہے جنہوں نے اس دور میں مخلصانہ اور مشفقانہ زندگی کی ایسی مثال پیش کی کہ جس کو بھی ان سے سابقہ پڑا اس نے فی زمانہ ایسے افراد بہت کم دیکھے، اور انہوں نے علم وتقویٰ کے نمونے پیش کیے، گودھرا کے مدرسہ میں اپنی علمی خدمات آخری دم تک پیش کرتے رہے، پوری زندگی اپنے اہل تعلق کے ساتھ مخلصانہ اور مشفقانہ رویہ کا قابل تقلید نمونہ پیش کیا، مجھ جیسے لوگ جو گودھرا سے بہت فاصلہ پر رہتے ہیں، ان کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ رکھا جیسا اپنے عزیزوں کے ساتھ رکھا جاتا ہے، وہ خود بھی وقتاً فوقتاً ندوہ تشریف لاتے اور مشفقانہ ملاقات کا مقصد ہوتا، اور جب بھی وہاں جانا ہوتا تواس دینی محبت کا پورا مظاہرہ ہوتا۔

ان کی اوران کے ادارہ کی کشش اور وہاں کے لوگوں کے تعلق کی بات تھی کہ ادھر گجرات کے جو ہمارے سفر ہوئے، کسی نہ کسی بہانہ دارالعلوم گودھرا کی کوئی تقریب نکل آئی، دارالعلوم کی کسی عمارت کا سنگ بنیاد، کسی کا افتتاح ہو، وہ ضرور یاد فرماتے، پہلی بار ۲۰۰۰ء میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے انتقال کے بعد دارالقرآن کی عمارت کے افتتاح اور طلباء تحفیظ القرآن الکریم کی ایمان افروز وروح پرور تقریب میں شرکت کی سعادت ملی تھی، جس میں گجرات کے بڑے علماء بھی تشریف رکھتے تھے، ادھر آخر میں دارالحدیث کی عمارت کے سنگ بنیاداور افتتاح کی تقریب بڑی نورانی مجلس تھی، جس کی یاد قائم رہے گی۔

مولانا مفتی محمد ابراہیم اچھودی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں ہوئی تھی، جہاں ان کے ساتھی مشہور محدث ومفتی مولانا سعید احمد پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ تھے، وہاں اس وقت کے بڑے عالم اور فقہ کے بڑے استاد حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن شاہجہاں پوری رحمۃ اللہ علیہ سے قرب واختصاص حاصل ہوگیا، ان کی شفقت ومحبت کا ہمیشہ انہوں نے خیال رکھا، اور وفات کے بعد ان کے افراد خاندان سے تعلق کو بنائے رکھا۔

ان کا اصلاحی تعلق ابتداءً حضرت مولانا مسیح اللہ خان جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے تھا، ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوا، پھر اس مناسبت سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے افراد خاندان سے زیادہ ربط وتعلق رکھا، اوراس کی کوشش رہی کہ ہر رمضان المبارک میں کچھ دن وہاں رہ کر گزاریں، جہاں وہ اپنے رفقاء کے ساتھ تشریف لاتے، اوران کے بیان سے ہم سب لوگ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے، بیعت وسلوک میں انہیں اجازت بھی حاصل تھی، اوران کی زندگی میں جوحزم واحتیاط تھا، وہ ان کے پورے طرز معاشرت سے معلوم ہوتا تھا۔

حضرت مولانا بڑے صاحب علم وصاحب درد انسان تھے، وہاں کے اساتذہ وطلباء کو ان سے عقیدت ومحبت تھی اوروہ بھی مدرسہ سے تعلق اپنے گھر کے افراد کی طرح رکھتے تھے، مدرسہ کے مہتمم مولانا عبدالستار صاحب اور وہ دونوں مل کر مدرسہ کو معیاری انداز سے چلا رہے تھے، مدرسہ میں دورہ تک تعلیم تھی، لیکن سال گذشتہ سے انہوں نے مخلصین کا مشورہ قبول کیا اور صحاح کی تعلیم شروع کی، بخاری شریف کا خود درس دیتے تھے، انتقال کے روز کا واقعہ بھی عجیب ہے کہ دن کے اوقات میں برابر بخاری پڑھائی اور مغرب بعد بھی جاری رکھنے کی کوشش کی، حالانکہ ایک عرصہ سے بیمار تھے چنانچہ اسی کوشش کے درمیان بیٹھے بیٹھے ان کی روح پرواز کرگئی، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

امید ہے کہ فرشتوں نے ان کا بڑا اچھا استقبال کیا ہوگا، ہم لوگوں کے پاس ان کے لیے صرف دعا ہے کہ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے، اور طالبان علوم نبوت کو ویسا بلند استاد پھر عطا فرمائے، اس موقعہ سے ہم ان کے پسماندگان سے اظہار تعزیت کرتے ہیں، مدرسہ کے اساتذہ وطلباء سے بھی تعزیت کرتے ہیں خصوصاً ان کے قریبی اور معاون مولانا اختر ندوی سے جنہوں نے اس ضعف پیری میں ان کے ساتھ تعاون و ہمدردی کی ، اوران کے سفروں میں ان کو راحت پہونچاتے رہے، ان سے ان کو بہت مدد ملتی تھی اوران کے ذریعہ سے دوری کے باوجود حال و خیریت معلوم ہوتی رہتی تھی ، اور وہ ان سے ربط کا ذریعہ بنتے تھے، مولانا محمد اختر ندوی کا یہ تعاون بہت لائق قدر تھا، اللہ تعالیٰ ان کو اس نیک عملی کا اچھا صلہ عطا فرمائے، اس واقعہ سے ان کو جو صدمہ پہونچا ہے، اس پر وہ بھی لائق تعزیت وہمدردی ہیں، ہم ان کے لیے دعا کرتے ہیں: اللّٰھم اغفر له وارحمه وتب علیه، انه هو التواب الرحیم ، وارفع درجته و تقبّل عمله وصلی الله علی سیدنا محمد وعلی آله وصحبه أجمعین۔

☆☆☆☆☆

تعارف وتبصرہ

مولانا ابوالجلال ندویؒ - دیدہ وشنیدہ وخواندہ

مولانا عبدالمتین منیری (بھٹکل)

نام کتاب: **مولانا ابو الجلال ندویؒ -دیدہ و شنیدہ و خواندہ**

(چڑیاکوٹی، شبلی اور فراہی کے علمی وارث کی زندگی کے چندنقوش)

تالیف: احمد حاطب صدیقی

تعارف: جناب عبدالمتین منیری

جب ہمارے شعور کی کچھ آنکھیں کھلیں اور اردو پڑھنا آنے لگا تو تب جو چیزیں اس وقت ہاتھ آئیں ان میں معارف اعظم گڑھ کے پرانے پرچے بھی تھے، جو ہمارے اس دنیا میں آنے سے پہلے شائع ہوئے تھے، ان پرچوں میں مختلف مضامین پر مولانا ابوالجلال ندوی کا نام نظر آتا، یہ مضامین غالباً اعلام القرآن پر ہوا کرتے تھے، انہیں پڑھ کر مولانا کی علمیت کا ایک رعب سا دل میں بیٹھ گیا۔ ۱۹۷۰ء میں جب اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے ہمارا الکلیۃ العربیۃ الجمالیۃ مدراس میں داخلہ ہوا جو جمالیہ عربک کالج کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے، تو وہاں ہمارے مشفق استاد مولانا عبد الرافع نائطی باقوی مرحوم سے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ مولانا ابوالجلال ندوی نے یہاں پر پرنسپل کی حیثیت سے کافی عرصہ گذارا ہے، تب ہمارا سینہ جذبہ تفخر سے بھر گیا کہ ایک ایسے تعلیمی ادارہ سے ہماری نسبت ہے جہاں آپ جیسے عبقری عالم نے اپنی عمر کے بڑے قیمتی دن گزارے ہیں، ہمارے استاد، مولانا ابوالجلال کے علم ومطالعہ میں غرق رہنے کے حالات بتاتے تھے، انہی سے ہم نے سنا کہ جب مولانا جمالیہ سے رخصت ہوکر گئے اوران کا بستر صاف کیا گیا تو اس کے نیچے سانپ اور بچھو پائے گئے جو مدت سے اس میں سکونت اختیار کیے ہوئے تھے، لیکن انہوں نے آپ کو کبھی ایذا نہیں پہنچائی تھی، اسی زمانے میں مولانا کے ایک ملباری شاگرد اور عربی زبان کے ادیب وشاعر احمد فلکی جمالی کا قصیدہ نظر سے گذرا جس میں جمالیہ کے مفاخر میں علامہ فاروق چریاکوٹی کی روایتوں کے امین اپنے ان استاد گرامی قدر کا ذکر بڑے فخر سے کیا گیا تھا، لیکن پھر مولانا کے بقید حیات ہونے یا نہ ہونے کی کوئی اطلاع عرصہ تک نہیں ملی، یہاں تک کے ۱۹۸۴ء میں جسارت کے ذریعہ آپ کے اس دنیا سے دائمی سفر پر روانگی کی اطلاع ملی اور رنج بھی ہوا کہ علامہ شبلی اور فراہی کے علوم کی امین یہ عظیم شخصیت اس دنیا سے اس خاموشی سے چلی گئی کہ ایک محدود حلقے کے علاوہ کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ علم وتحقیق کا کتنا روشن سورج ہمیشہ کے لیے موت کی تاریکی میں چھپ گیا ہے، آخر پتہ بھی کیسے چلتا، اتنے عظیم عالم کی تحقیقات معیاری مجلّات کی فائلوں میں دب کر رہ گئیں تھیں، ان کے نصیب میں دوبارہ کتابی شکل میں آنا نہیں لکھا تھا۔

مولانا کسی ادارہ یا جماعت وتحریک سے وابستہ کہاں تھے؟ جو آپ کی پذیرائی کے اسباب ہوتے، اب مولانا کی رحلت پر بھی چونتیس سال کا عرصہ گزر گیا ہے، آپ کو جاننے والے بھی بھول بھال گئے ہیں، لیکن بعض تحریروں سے یہ بات معلوم ہونے لگی کہ اردو کے مایۂ ناز ادیب، کالم نگار وشاعر احمد حاطب صدیقی (ابونثر) آپ کے بھتیجے اور فرائیڈے اسپیشل کے چیف ایڈیٹر یحیی بن زکریا صدیقی آپ کے بڑے نواسے ہیں، اور یہ دونوں اپنے بزرگوار کی زندگی کے نقوش اور آپ کے علمی ورثہ کو منظر عام پر لانے کے لیے کوشاں ہیں، ہمیں امید ہے کہ ان پسماندگان کی کوششیں مولانا کو علمی وتحقیقی دنیا میں زندہ و جاوید کریں گی ۔ مولانا کے ان عزیزوں کی کوششوں کا پہلا قطرہ احمد حاطب صدیقی کی کتاب ''مولانا ابوالجلال ندوی-دیدہ وشنیدہ وخواندہ'' کی شکل میں اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی سے منظر عام پر آیا ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

مؤرخ ہند مولانا عبدالحی حسنی علیہ الرحمۃ نے اپنے سفرنامہ گجرات (یادایام) میں برصغیر میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں گزرنے والی عظیم ترین علمی شخصیت اور مقبول ترین بزرگ مخدوم فقیہ علاء الدین علی مہایمی نائطی کے بارے میں ان الفاظ میں تاثرات بیان کیے ہیں:

''شیخ علاء الدین علی بن احمد المہائمی گجرات کے لیے سرمایۂ ناز ہیں اور میرے نزدیک ہندوستان کے ہزار سالہ دور میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے سوا حقائق نگاری میں ان کا کوئی نظیر نہیں، مگر ان کی نسبت یہ معلوم نہیں

کہ وہ کس کے شاگرد تھے، کس کے مرید تھے، اور مراحل زندگی انہوں نے کیوں کر طے کیے تھے، جو تصنیفات ان کی پیش نظر ہیں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہیں کہ ایسا شخص جس کو ابن عربی ثانی کہنا زیبا ہے، وہ کسمپرسی کی حالت میں ہے، کہیں اوران کا وجود ہوا ہوتا تو ان کی سیرت پر کتنی کتابیں لکھی جا چکی ہوتیں، اور کس پُر فخر لہجہ میں مؤرخین ان کی داستانوں کو دہراتے''۔

[یادایام: ص/ ۵۹]

احمد حاطب کی کتاب دیکھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ مولانا ابو الجلال مرحوم پر بھی ایسی ہی کوئی بات صادق آتی ہے۔

احمد حاطب کی کتاب احسان شناسی کا ایک مظہر ہے، یہ عام معنوں میں کوئی سوانح عمری نہیں ہے، لیکن اس کے مؤثر انداز نے مزید سوچنے اور تحقیق کرنے کی راہیں کھول دی ہیں، اس نے آئندہ اس موضوع پر تحقیق کرنے والے کا کام آسان کردیا ہے، احمد حاطب نے معلومات کے جو موتی چنے ہیں، انہیں پروکر قیمتی ہار تیار کیا جاسکتا ہے، اس کتاب کو دیکھ کر یہ احساس ابھرتا ہے کہ مصنف کتاب علمی امانت کا ایک بھاری بوجھ گزشتہ چالیس سالوں سے اپنے کاندھوں پر لادے ہوئے تھے، اب انہوں نے امانت کا یہ بوجھ اپنے کندھوں سے ہٹا کر آنے والی نسلوں کے کاندھوں پر ڈال دیا ہے، مصنف کے یہ الفاظ اس کے مصداق ہیں:

''یہ عاجز اب ان گنے چنے چند باقی ماندہ افراد میں سے ایک ہے، جنہوں نے مولانا ابوالجلال ندوی کو دیکھا، ان کو سنا، ان کے متعلق دوسروں سے سنا، خود انہیں پڑھا اور ان سے متعلق دوسروں کا لکھا ہوا بھی پڑھ لیا، بس یہی سبب اس کتاب کے نام کا سبب بھی بن گیا: مولانا ابو الجلال ندوی: دیدہ وشنیدہ وخواندہ''۔

مصنف نے مشرقی یوپی کے مردم خیز علاقوں جونپور، چریا کوٹ، محی الدین پور، اعظم گڑھ وغیرہ میں آج سے ایک صدی قبل کے علمی منظر نامہ پر خوب روشنی ڈالی ہے، آپ نے خاندانی پس منظر کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس فرزند کی نسل سے ہیں جو ہجرت مدینہ کے دوران غارِ ثور میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پناہ لینے اور یہاں پر ایک سانپ کے ڈسنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لعاب دہن سے شفایابی کے مشہور واقعہ کے بعد پیدا ہوئے، اور ان کے بارے میں مشہور ہے کہ ان پر سانپ کے ڈسنے کا اثر نہیں ہوتا، اس کا چشم دید واقعہ نصف صدی پیشتر مولانا عبدالرافع باقوی مرحوم نے ہمیں بتایا تھا۔

مصنف نے اس وقت کے دارالمصنفین کے ذکر میں بعض تلخ حقیقتوں کی نشاندہی کی ہے، جن تنگ دستیوں میں اس ادارے سے وابستہ محققین اور مصنفین نے اپنا خون جلایا ہے اس کی جانب اشارے بھی کیے ہیں، انہیں جان کر دکھ ہوتا ہے، ہمارے محدود علم کی حد تک ان حالات میں بہت زیادہ فرق اب بھی نہیں آیا ہے، دارالمصنفین کے مادی حالات اب بھی وہی ہیں جن کا تذکرہ مصنف نے کیا ہے۔

مصنف نے کتاب کو بارہ فصلوں میں تقسیم کیا ہے:

فصل اول میں اپنے تایا مولانا ابو الجلال ندوی سے وابستہ بچپن کی یادوں کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔

فصل دوم میں چریاکوٹ کی سرزمین سے اٹھنے والے والی شخصیات کا تذکرہ ہے، جنہوں نے جونپور کو مشرق کا شیراز بنادیا تھا، ان میں مولانا عنایت رسول، ان کے بھائی مولانا فاروق چریاکوٹی جیسے بزرگوں کا ذکر ہے جن سے سرسید احمد خان اور علامہ شبلی نے کسب فیض کیا، اور ان کے پڑھانے اور طلبہ میں علمی صلاحیت پیدا کرنے کے انداز تعلیم کا بیان ہے

فصل سوم: ندوۃ العلماء کا ذکر ہے جہاں آپ نے علامہ شبلیؒ سے فیض حاصل کیا، اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کی رفاقت پائی، ندوہ میں آپ کے اساتذہ میں سے شبلی فقیہ، مولانا امیر علی محدث (مصنف تفسیر مواہب الرحمٰن) شیخ خلیل عرب کے والد شیخ محمد عرب کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

فصل چہارم: آبائی گاوں محی الدین پور کا ذکر ہے۔

فصل پنجم: آپ کی دارالمصنفین اعظم سے پہلی وابستگی۔

فصل ششم: مولانا کی دارالمصنفین سے رخصت اور مدراس کے جمالیہ عربی کالج کا اہتمام۔

فصل ہفتم: مدراس سے بیس سال بعد واپسی اور دارالمصنفین سے دوبارہ تعلق اور اعلام القرآن کی تصنیف۔

فصل ہشتم: دوبارہ مدراس روانگی۔

فصل نہم: موہنجوڈارو کی زبان کا علم، اور اس کی دو ہزار سے زیادہ مہروں کے پڑھنے کی تفصیلات۔

فصل دہم: تحریک خلافت سے وابستگی۔

فصل یازدہم: ذوق شعری اور نمونہ کلام۔

فصل آخر: مختلف مضامین کے اقتباسات۔

مولانا ابو الجلال ندوی غالبًا مولانا حمید

الدین فراہی کے بعد واحد شخص تھے جنھوں نے باقاعدہ عبرانی زبان سیکھی تھی ، اور اہل کتاب کے مقدس اسفار براہ راست پڑھتے اور سمجھتے تھے ،اورکئی ایک علوم میں یکتا تھے ،ان کی تحقیق کا اہم محور ملت ابراہیم اور حنیفیت کی کھوج تھی ،اور ہندوؤں میں رائج رامائن وغیرہ مذہبی داستانوں کے تانے بانوں کو فراعنہ مصر سے جوڑنا تھا ،اور اس سلسلے میں آزاد ہندوستان کے واحد گورنر جنرل اور بقول بعضے ہندوستان کے واحد اسٹیٹسمین راجگوپال اچاریہ (راجہ جی) کے ساتھ مدراس کے ابتدائی قیام میں گفتگو بڑی ندرت رکھتی ہے۔

ملت حنیفیہ کی نشان بستی موہنجوڈارو سے مولانا کا تعلق مدراس کے قیام میں ہوا تھا ،اس سلسلے میں تاریخی مواد یہیں کے کتب خانوں سے انہیں پہلے پہل حاصل ہوا تھا ، مولانا پاکستان ہجرت کے ارادے سے نہیں گئے تھے ، بلکہ موہنجوڈارو انہیں اپنی تحقیق مکمل کرنے کے لیے کھینچ لے گیا تھا ،اور حالات ایسے ہوگئے کہ واپس ہندوستان نہ آسکے ،لہٰذا انہوں نے اپنے تحقیقی کام کے لیے وہاں کی حکومت کے سامنے کاسہ لیسی نہیں کی ۔ دیکھئے مولانا کی بے قدری کا کتنا بڑا نقصان علم وتحقیق کا ہوا ، ذرا کتاب کی اس عبارت کو پڑھئے اور سوچئے:

’’میں تو یہاں اس لیے نہیں آنا چاہتا تھا کہ جس چیز کی میں نے مخالفت کی ہے ، اس سے فائدہ کس منہ سے اٹھاؤں ؟ ہم نے پوری کوشش کی تھی کہ ملک تقسیم نہ ہو ، ہماری مرضی کے خلاف ملک تقسیم ہوگیا ، ہم نے تسلیم کرلیا ، پھر اس کی مخالفت نہیں کی ، میں آیا تھا اس لیے کہ مجھ کو موہنجوداڑو کی مہروں پر تحقیق کرنی تھی ، مجھ کو دلی میں روکا گیا کہ یہیں بیٹھ کر تحقیق کیجیے ، مولانا آزاد کے سکریٹری جو تھے اجمل خان اور عبدالرزاق ملیح آبادی جو میرے ساتھ پڑھے ہوئے تھے ، وہ روک رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ یہیں آپ رہیے ، یہیں کام کیجیے ، یہیں آپ کو سب مدد مل جائے گی ، کانگریس پوری مدد دے گی ، میں نے کہا: میں کانگریس کی مدد لے کر کاہے کو اپنے کو بدنام کروں ، مجھے اب افسوس ہوتا ہے کہ میں وہیں رک گیا ہوتا یا مدراس میں رہ گیا ہوتا تو اپنی سب چیزیں شائع کرواسکتا تھا‘‘ ۔

یہ خواہش ظاہر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ کتاب کو اور مفصل ہونا چاہیے تھا ،بعض مزید ضروری معلومات اس میں ہونی چاہیے تھیں ،لیکن پھول نہیں تو پنکھڑی ہی سہی ، ہمیں مولانا کے نواسے یحیی بن زکریا صدیقی کی محنتوں کے نتیجے میں منظر عام پر آنے والے مولانا کے علمی آثار کے مجموعے کا انتظار ہے۔

ہماری ناقص رائے ہے کہ مخدوم مہایمی علیہ الرحمۃ کے تعلق سے تاریخ میں جو کوتاہی ہوئی ، اس کی بنیادی وجہ آپ کا جنوبی ہند سے ہونا ہے ، اور مولانا ابوالجلال ندوی سے بھی بے اعتنائی کا بنیادی سبب آپ کی زندگی کے زیادہ تر ایام کا مدراس (چنئی) میں گزرنا ہے ، جس کی ایک وجہ یہاں کے علمی پس منظر کے بارے میں معلومات کی کمی بھی ہوسکتی ہے ،لہٰذا جس طرح مشرقی یورپ کے علمی منظر نامے کا تذکرہ ہوا ، مصنف آپ کے مدراس کے احباب سے سرسری گزر گئے ہیں ، کچھ یہی حال مولانا پر شاہ محی الحق فاروقی کے خاکے کا بھی ہے ،اس سلسلے میں کچھ تفصیلات سامنے آنی چاہئے تھیں ،تاکہ معلوم ہوسکے کہ مولانا ابوالجلال ندوی نے جب مدراس کو منتخب کیا تھا ، تو سامنے صرف کشادگی معاش نہیں تھی ، بلکہ مدراس کا علمی ماحول آپ کے مزاج کے لیے کتنا سازگار تھا؟ چونکہ اس ناچیز نے مدراس (چنئی) کی اس تلچھٹ کو پایا ہے جو مولانا ابو الجلال ندوی مرحوم ہمارے وہاں جانے سے بیس پچیس سال پہلے چھوڑ گئے تھے ، اور وہ شخصیات جنہیں آپ نے عنفوان شباب میں برتا تھا ان میں سے کئی ایک ہمارے زمانہ طالب علمی میں پیرانہ سالی کے دور سے گزر رہی تھیں ، برسبیل تذکرہ سرسری طور پر ان کا بھی کچھ تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

جمالیہ عربک کالج کو ۱۸۹۸ء میں ترچناپلی کے ایک صاحب خیر تاجر جمال محی الدین نے قائم کیا تھا ،اور انہی کے قائم کردہ وقف سے یہ ادارہ چلتا تھا ، اس کے لیے چندہ نہیں ہوتا تھا ، جمالیہ کے علاوہ مدراس کی سب سے بڑی جامع مسجد پیریمیٹ آپ کی یادگار ہے۔آپ کے فرزند جمال محمد نے ملی خدمت میں بڑا نام کمایا ، مدراس میں جمال محمد ہائی اسکول ، اور ترچناپلی میں جمال محمد کالج آپ کی یادگاریں ہیں ، حکیم اجمل خان آپ کے خاص دوستوں میں تھے ، جامعہ ملیہ کے کام سے ڈاکٹر ذاکر حسین کو خاص طور پر انہوں نے آپ کے پاس بھیجا تھا ، علامہ سید سلیمان ندوی اور علامہ اقبال کے مدراس کے خطبات کے اصل محرک آپ ہی تھے ، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں آپ کا تعمیر کردہ جمالیہ ہال آج بھی موجود ہے ، اس خاندان کی ۱۹۱۸ء

سے مسلم لیگ سے وابستگی رہی، تقسیم ہند کے بعد قائم شدہ انڈین یونین مسلم لیگ کے پہلے صدر قائد ملت محمد اسماعیل مرحوم آپ کے داماد تھے، اسی طرح آپ کے فرزند جمال محی الدین آزادی کے بعد مسلم لیگ سے ممبر پارلیمنٹ رہے، اول الذکر کے احترام کا یہ عالم تھا کہ پارلیمانی الیکشن کے موقعہ پر وہ کبھی اپنے حلقے میں ووٹ مانگنے نہیں جاتے تھے، اس کا تذکرہ آصف جیلانی نے جسارت کے اپنے ایک کالم میں بھی تفصیل سے کیا ہے، آپ کے ایک فرزند جمال احمد انگریزی زبان کے شاعر، چوتھے فرزند جمال حسین مدراس ہائی کورٹ کے جج تھے۔ جمال محمد کا شمار مدراس کے بڑے تاجروں میں ہوتا تھا، آپ کے زمانے میں جمالیہ کو وسعت ملی، یہ گزشتہ تیس سال قبل تک برصغیر کی واحد دینی درسگاہ تھی جہاں پر ذریعہ تعلیم عربی تھا، اور ۱۹۶۸ء تک تو حکومت مصر اپنے خرچہ پر ازہر کے اساتذہ کو یہاں پڑھانے کے لیے باقاعدہ بھیجا کرتی تھی۔

دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کے خاندانی ادارے ان کے قائم کرنے والوں کے معاشی حالات بدلنے کے بعد زیادہ دیر اپنی حالت میں نہیں رہتے، جمالیہ کے ساتھ بھی یہی ہوا، جب ہمارا یہاں پر داخلہ ہوا تھا تو اس کا دور زوال شروع ہو چکا تھا، لیکن اس کا بھرم ابھی باقی تھا، ہندوستان سے مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ کی تیاری سے قبل عمر آباد وغیرہ بڑے تعلیمی اداروں کے فارغین یہاں عربی زبان کا معیار بہتر کرنے کے لیے آتے تھے، ہمارے زمانے میں یہاں پر اکثریت ملیشیا، انڈونیشیا، سری لنکا، تھائی لینڈ کے طلبہ کی تھی، چند ایک طالب علم بوسنہ کے بھی تھے جو اس وقت یوگوسلاویا کا حصہ تھا، اول الذکر ممالک میں جمالیہ کی سند کو بڑے وقار کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، جمال محمد ساتھ ساتھ اچھا علمی ذوق بھی رکھتے تھے، امپورٹ اکسپورٹ کی سہولت اور مدراس کی بندرگاہ کہ اہمیت کے پیش نظر آپ کو لبنان اور مصر سے کتابیں منگوانے کی جو سہولت حاصل تھی اس زمانے میں ایسی سہولت کم ہی لوگوں کو رہی ہوگی، جمال محمد مرحوم نے باہر ممالک سے خوب نئی نئی کتابیں منگوائیں، مدت دراز کے بعد وہاں پر ہمیں بھی جو کتابیں ملیں ویسی کتابیں بعد میں کہیں اور پڑھنے کو نہیں مل سکیں، ہمارا خیال ہے کہ جس طرح علامہ شبلیؒ کے لیے باہر کی نادر کتابوں تک رسائی آسان تھی، کچھ یہی کیفیت جمال محمد کی مولانا ابوالجلال ندوی کے ساتھ رہی ہوگی، جمالیہ اسی وجہ سے مولانا کے پاؤں کی بیڑی بنا رہا۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد شہر مدراس علم جدید کا گہوارہ رہا ہے، انگریزی زبان کا چلن یہاں پر سب سے زیادہ عام تھا، ۱۹۷۰ء کی دہائی تک جب کہ یہاں ہندی اور ٹامل کا جھگڑا شروع نہیں ہوا تھا، اور ٹامل قوم پرست تحریک حاوی نہیں ہوئی تھی، مشہور تھا کہ یہاں کا تانگہ اور رکشا چلانے والا بھی انگریزی فرفر بولتا ہے، لہٰذا یہاں کی یہ خصوصیت رہی کہ دوسرے علاقوں کے مقابلے میں جدید وقدیم پر یکساں عبور رکھنے والے علماء یہاں پر بہ نسبت دوسرے شہروں کے زیادہ پائے گئے، جمالیہ کو ساٹھ ستر سال تک مسلسل یہ شرف حاصل رہا کہ اسے فصیح انگریزی اور عربی بولنے والے پرنسپل نصیب ہوئے، یہاں کے مشہور پرنسپلوں میں ہمارے استاد مولانا عبدالوہاب بخاری تھے جو مدراس کی باوقار پریسڈنسی کالج میں شعبہ تاریخ کے صدر رہے، آپ کا شمار مسلمانوں کے بڑے عصری تعلیمی اداروں میں سے ایک نیو کالج مدراس کے بانیوں میں ہوتا ہے، مولانا ابوالجلال ندوی کے جانے کے بعد یہی یہاں کے پرنسپل بنے تھے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے آپ کے بارے میں لکھا تھا کہ آپ مسلمانوں میں انگریزی زبان کے سب سے بڑے مقرر ہیں، اور یہ بھی لکھا کہ ڈاکٹر عبدالحق کرنولی جنوب کے سرسید ہیں تو مولانا بخاری محسن الملک۔ یہ دونوں یار غار تھے، ڈاکٹر عبدالحق علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے، آکسفورڈ کے سند یافتہ تھے، عربی اردو انگریزی پر یکساں عبور تھا، فسانہ آزاد کی پوری جلدیں پڑھ ڈالی تھیں، زیر تبصرہ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا مولانا ابوالجلال کے علم پر بڑا اعتماد تھا، یہاں کے ایک اور پرنسپل ہمارے استاد مولانا محمد حسین بنگلوری مرحوم بھی تھے، دینی علوم میں فضیلت کے بعد آزادی سے قبل پریسڈنسی کالج سے قانون میں ماسٹر ڈگری ایل ایل ایم حاصل کی تھی، اسلامیہ کالج کرنول میں عرصے تک پرنسپل رہے، فقہ اور اصول کے امام تھے۔ پروفیسر یوسف کوکن عمری کے بعد جمالیہ بجھ سا گیا، ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم کا شمار بھی ایک لحاظ سے مدراس والوں میں ہونا چاہیے، ان کے والد مولانا خلیل اللہ مدراس ہی سے حیدرآباد گئے تھے، آپ کے تایا زاد مولانا قاضی حبیب اللہ مرحوم کا تذکرہ مصنف نے کیا ہے،......

..................بقیہ صفحہ ۳۲؍پر

رحمت عالم

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سب کے لیے

مولانا سیّد آصف ملّی ندوی (ناندیڑ، مہاراشٹر)

بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ ادب ہے، اوراس کا احترام ہمارے ایمان کا خاصہ ہے، محبت کے اظہار میں اگر ہوش وبصیرت سے کام نہ لیا گیا تو لغزشوں کے امکانات بڑھ سکتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ایک ایسا چراغ تھی جو چودہ سو سال گذرنے کے بعد بھی اپنی روشنی سے دنیا کو منور کررہی ہے اور آگے بھی کرتی رہے گی۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا دائرہ صرف آپؐ پر ایمان لانے والوں ہی تک محدود نہیں رہا ہے بلکہ اغیار بھی آپؐ کی رحمت کے سائبان میں پناہ لیتے رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جب ہم سیرت نگاروں یا آپؐ کے ثناخوانوں کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ جان کر مسرت انگیز حیرت ہوتی ہے کہ آپؐ کے سیرت نگاروں اور آپؐ کے ثناخوانوں میں یہودی، عیسائی اور ہندو عقیدت کیش سیرت نگاروں وثناخوانوں کی بھی ایک بڑی تعداد نظر آتی ہے جنہوں نے آپؐ کے تذکرۂ مبارک، سیرت نگاری اور آپؐ کی شانِ اقدس میں منظوم گلہائے عقیدت پیش کرکے خود اپنے آپ کو اور اپنی تحریروں کو حرمت و وقار بخشا ہے۔ اس مختصر مضمون میں بطور مشتے نمونہ از خروارے چند غیر مسلم سیرت نگاروں کی کتب سیرت کا اجمالی تذکرہ اور چند دانشوروں کے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تاثرات اور غیر مسلم شعراء کی عقیدت ومحبت سے لبریز نعت گوئی و ثناخوانی کے نمونے اس اعتراف کے ساتھ پیش خدمت ہے کہ یہ کوئی میری اپنی تحقیق نہیں ہے، بلکہ اس عنوان پر متعدد ماہرین سیرت و تاریخ اہلِ قلم حضرات نے نہایت ہی قابلِ قدر وبیش بہا کام کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور انہیں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت واخروی سرخروئی نصیب فرمائے، آمین۔

Vie De Mohamet:
by Constant V. Georgio

یہ کتاب رومانیہ کے مشہور دانش ور، ناول نگار اور بین الاقوامی تعلقات کے ماہر کانسٹنٹ ورجل جورجیو نے تالیف کی ہے جو ایک مسیحی اسکالر تھے، ایک مشہور مصنف اور صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے جیور جیو کا نام اور مقام اہلِ مغرب کے ہاں مسلمہ حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ۱۵/ستمبر ۱۹۱۶ء کو ویلیا البا رومانیہ میں پیدا ہوئے، اور ۲۲/جون ۱۹۹۲ء کو پیرس فرانس میں وفات پائی۔ ۱۹۳۶ء میں اعلیٰ نمبروں کے ساتھ ابتدائی تعلیم مکمل کی، بعد ازاں بچارسٹ یونیورسٹی اور ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے فلسفے اور الٰہیات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ جنرل ایان انٹونیسکو کے دورِ حکمرانی (۴۳-۱۹۴۲ء) میں رومانیہ کی وزارتِ خارجہ میں بین الاقوامی امور کے ماہر کی حیثیت سے ذمہ داریاں ادا کیں، لیکن جب ۱۹۴۲ء میں روس کی کمیونسٹ فوجیں رومانیہ پر قابض ہوگئیں تو جیورجیو نے جلاوطنی اختیار کرلی۔ جنگ عظیم دوم کے خاتمے پر امریکی افواج نے انہیں گرفتار کرلیا۔ تاہم رہائی کے بعد ۱۹۴۸ء سے فرانس میں سکونت اختیار کرلی، فرانس میں قیام کے دوران موصوف نے مختلف علمی اور مذہبی سرگرمیوں سے وابستگی اختیار کرلی۔

سچائی کی تلاش میں کانسٹنٹ نے سیرت پاک کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا اور ایک غیر مسلم ہونے کے باوجود جب ان کے دل نے سیرت مطہرہ کی عظمت کو قبول کیا تو اعترافِ حق کے طور پر جذب ومستی میں یہ کتاب تصنیف کی۔ ۱۹۶۱ء میں اس کتاب کو لیویا لیمور (Livia Lamoure) نے رومانوی زبان سے فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ ۱۹۷۹ء میں گجرات کی ایک علم دوست شخصیت جناب مشتاق حسین میر نے اسے (محمد پیغمبر اسلام) کے نام سے اردو زبان کے قالب میں ڈھالا۔ فاضل مترجم نے کتاب کے بارے میں اپنا تاثر ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ’’اس کتاب کو کھول کر جیسے ہی آپ مطالعہ کریں گے، آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ کتاب حیاتِ طیبہ پر لکھی گئی کتب سے مختلف ہے، اور آپ جتنا آگے بڑھتے جائیں گے، آپ کے احساسات، تاثرات اور خیالات میں انقلاب آتا چلا جائے گا، جبکہ کتاب کے آغاز میں دنیائے اسلام کے مایہ ناز اسکالر علامہ محمد اسد (سابق یہودی اسکالر: لیوپولڈویز) کا وقیع مقدمہ درج ہے۔

کیرن آرمسٹرانگ

عہدِ رواں کی مشہور و معروف برطانوی

مصنفہ ہے جو برطانیہ کے ویسٹ مڈلینڈ کے علاقے ووسٹر شائر سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نے متعدد کتب تصنیف کی ہے جن کا موضوع و مقصد دنیا بھر کے بڑے مذاہب بالخصوص اسلام، مسیحیت اور یہودیت کا ایسا مطالعہ پیش کرنا ہے۔ جس سے ان مذاہب کے ماننے والوں کی آپس میں قربت پیدا ہو، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام سے متعلق اس نے متعدد کتب تصنیف کی ہیں، جن میں سے (Mohammed: A Biography of the Prophet) کا اردو ترجمہ جناب نعیم اللہ ملک نے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر اسلام کی سوانح حیات) کے نام سے کیا ہے، اور معروف پبلشر نشریات لاہور نے اس ترجمہ کو بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ ایک دوسری کتاب (The Prophet of our Time) جس کو جناب یاسر جواد نے (پیغمبر امن : سیرت النبیؐ اکیسویں صدی کے نئے چیلنجوں کے تناظر میں) کے نام سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے، اس کتاب میں مصنفہ نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر سی مدت میں عرب کے قبائل کو تہذیب وتمدن سے آراستہ کر کے دنیا کی حکمرانی کے قابل بنا دیا جو بظاہر ایک ناقابل یقین کام تھا، لیکن مقام افسوس ہے کہ عہدِ رواں کے مسلمانوں نے پیغمبر اسلام کے پیغامِ امن وسلامتی کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے۔

Prophet of Desert: by K.L.Guaba

کے ایل گابا معروف قانون دان، سیاست دان اور ادیب تھے، لاہور کے ایک ہندو صنعت کار لالہ ہرکشن لال گابا کے ہاں پیدا ہوئے، بار ایٹ لا کرنے کے بعد لاہور میں پریکٹس شروع کی۔ ۱۹۲۳ء میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانفرنس لاہور کی مجلس استقبالیہ کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ اخبارات کے لیے مضامیں لکھے اور اپنا ہفتہ وار دی سنڈے ٹائمز بھی جاری کیا۔ ۱۹۲۶ء میں لاہور کے صنعتی حلقے سے رائے بہادر دھنپت رائے کے مقابلے میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا الیکشن لڑا، ۱۹۲۲ء میں اسلام قبول کیا۔ مشہور ہے کہ شاعر اسلام علامہ اقبال کی تجویز پر کنہیا لال (کے ایل) گابا سے خالد لطیف (کے ایل) گابا ہو گئے۔ یوں ان کے نام کا انگریزی مخفف اور صوتی ولفظی تاثر قائم رہا۔

قبول اسلام کے بعد جناب کے ایل گابا نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پر ایک کتاب لکھی جس کا نام (Prophet of Desert) پیغمبر صحرا ہے۔ اس کتاب کی قبولیت کے حوالے سے وکی پیڈیا میں ایک بہت ہی ایمان افروز واقعہ قلمبند کیا گیا ہے۔ لکھا ہے کہ کنہیا لال گابا نے ۱۹۳۳ء میں اسلام قبول کیا، انہیں دوبارہ ہندو بنانے کے لیے بڑا زور لگایا گیا مگر وہ آخر دم تک اسلام پر قائم رہے۔ آپ کی کتاب (Prophet of Deser) پیغمبر صحرا بڑی مقبول ہوئی۔ کے ایل گابا کسی وجہ سے حکومت وقت کے زیرِ عتاب آ گئے اور ایک مقدمے میں قید کر دیے گئے، اس دور کے مسلمانوں نے بڑی کوششیں کیں، یہاں تک کہ اخبارات میں زرِ ضمانت اور رہائی کے لیے اپیلیں بھی شائع ہوئیں لیکن ضمانت نہ ہو سکی اور جیل سے رہائی نہ ہو سکی۔ سیالکوٹ کے ایک ٹھیکیدار ملک سردار علی کو خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا سردار علی لاہور جا کر نومسلم خالد لطیف گابا کی ضمانت دو۔ اس نے ایک کتاب لکھی ہے جو مجھے بہت پسند ہے۔ سردار علی لاہور آئے اور دیڑھ لاکھ کی خطیر رقم کی ضمانت دے کر رہائی دلوائی۔ جناب خالد لطیف گابا کی تصنیف جسے بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں قبولیت کا شرف حاصل ہوا، سیرت کے موضوع پر لکھی جانے والی انگریزی کتب میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے اور بیسٹ سیلر قرار پائی ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ (پیغمبر صحرا) کے نام سے جناب پروفیسر احمد الدین مارہروی نے کیا ہے۔

کتاب کی تمہید میں کے ایل گابا لکھتے ہیں کہ:

آج کی دنیا کو جن مسائل کا سامنا ہے، ان میں سے چند بڑے اور زیادہ اہم اور سنگین مسئلے یہ ہیں: قومیت اور بین الاقوامیت، مرد وزن کا باہم اختلاط، طلاق کی شرح میں روز افزوں اضافہ، آمریت اور جمہوریت کی کشمکش، سرمایہ اور محنت کی آویزش، بڑھتا ہوا الحاد، خالی گرجا اور بھوکے مبلغ۔ تاریخ میں یہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا ہے کہ انسان خدا سے خفا اور بیزار ہو گیا ہے، یا پوری انسانیت کو انتہائی خطرناک اور مہیب مسائل کا سامنا ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے بلکہ قدرتی بات ہے کہ یوروپ اور امریکا میں کثیر الازدواجی، آسان طلاق، میراث کے منصفانہ اصول کی بنیاد پر تقسیم دولت کا بندوبست، مختلف قوموں اور فرقوں میں اخوت اور رواداری پیدا کرنے کی ضرورت، رنگ ونسل وطبقہ وزبان کے تعصّبات وامتیازات کا خاتمہ، سود پر مبنی معاشی نظام کا زوال اور دیگر ملتے جلتے مسائل پر مباحثے اور

مذاکرات ہونے لگے ہیں۔ یاد رہے کہ چھٹی صدی کے اختتام اور ساتویں صدی کے آغاز میں بھی ایسے ہی مسائل ابھرے تھے، اور ان پر مباحثوں اور مذاکروں کا دور گذرا تھا۔ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوجائیگا کہ اس وقت ایک سادہ مزاج، درویش منش شتربان نے کیونکر ان مسائل و مشکلات کو حل کیا تھا۔(ص:۸)

رسول عربیؐ: جی، اس، دارا (گرودت سنگھ دارا)

جناب گرودت سنگھ دارا ابتدا میں لاہور ہائی کورٹ میں بیرسٹر تھے، بعدازاں وہ لندن سے شائع ہونے والے جریدے (انڈیا) کے مدیر رہ چکے ہیں۔ ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انگریزی، اردو، عربی، فارسی اور پنجابی زبانوں سے واقف تھے۔ موصوف اپنی کتاب رسول عربی کی تمہید میں رقمطراز ہیں: ''میں ۱۸؍سال کی عمر میں نائب تحصیلدار کی حیثیت سے ملازم ہوا، دس سال کئی ایک اسامیوں پر تعینات رہ کر آخر ملازمت سے سبکدوشی اختیار کی۔ ترک ملازمت کی اصل وجہ بھی رشوت اور تعصب کے بھوت تھے جن سے بہت دیر تک میں جدوجہد کرتا رہا، آخر کر ہار کر میدان چھوڑا اور بھاگ نکلا۔ جنگ یوروپ کے ایام میں رخصت لے کر ۱۹۱۴ء میں انگلینڈ آیا۔ یہاں سے آئیرلینڈ گیا اور وہاں سے بیرسٹری کر کے وطن واپس چلا گیا۔ ۱۹۱۹-۱۹۲۰ء میں پھر لندن کا رخ کیا۔ یہاں پہنچ کر رسالہ ہند (انڈیا) شروع کیا، جس کی ایڈیٹری میں اب مجھے انیسواں سال ہونے کو ہے''۔

اپنی کتاب رسول عربی کی وجہ تالیف کا تذکرہ کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں کہ: ''میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات پڑھوں اور جو جو باتیں میں نے سنی ہیں، ان کی تصدیق یا تردید کی جستجو کروں۔ پہلی دفعہ جب میں نے اس مضمون پر ایک کتاب دیکھی تو اس کے پڑھنے سے مجھے از حد دلچسپی پیدا ہوگئی۔ جوں جوں میرا مطالعہ بڑھتا گیا، اتنی ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت میرے دل میں بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ میرے دل میں ایک آرزو پیدا ہوگئی کہ میں ان سب خیالات کو ایک جگہ اکٹھا کروں۔ طرح طرح کی کتابوں کے مطالعے نے جو میں نے اس مضمون پر پڑھی تھیں، میرے عالمِ خیال میں ایک پھلواری سی پیدا کردی۔ پنجابی، ہندی، اردو، فارسی، عربی کے پھول جہاں جہاں سے مجھے دستیاب ہوئے میں نے اپنے گلدستے کے لیے چن لیے اور نام اس کا رسول عربیؐ رکھ کر قوم کی خدمت میں نذر کیا''۔[ص:۱۹]

جی، اس، دارا صاحب کی اس کتاب ''رسول عربیؐ'' کی مقبولیت، افادیت اور اہمیت کا اندازہ کتاب میں شامل ان نامور شخصیات کے پیشِ لفظ، دیباچہ اور تبصرے سے کیا جاسکتا ہے جوفنِ سیرت نگاری ونعت گوئی اور زبان وادب میں سند کا درجہ رکھتے ہیں، شاہنامۂ اسلام کے شاعر جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری نے اس کتاب کا پیش لفظ تحریر کیا ہے جبکہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس کا دیباچہ تحریر فرمایا ہے۔ آپ اپنے دیباچے میں کتاب اور صاحبِ کتاب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں: ''اس کتاب کے مصنف جی، اس، دارا، بی ایل، بیرسٹرایٹ لاء (لاہور) سے لندن میں ملنے جلنے کا اکثر اتفاق ہوا۔ ان کی بے تعصبی اور توحید پرستی دیکھ کر دل بہت خوش ہوا کہ اگر ہندوستان کے مختلف فرقوں میں ایسی انسانیت ومحبت کے چند افراد پیدا ہوجائیں تو ابنائے ہند کی باہمی الفت کی دیوار اس قدر مستحکم ہوجائے کہ باہر کے دشمن اس کو کبھی توڑ نہ سکیں۔

دارا صاحب نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری بڑی بے نفسی اور بے تعصبی کے رنگ میں لکھی ہے۔ کتاب کے حرف حرف سے عشق ومحبت کے آبِ کوثر کی بوندیں ٹپکتی ہیں اور معلوم ہوتا کہ لکھنے والے کا قلم کس جوش وخروش کے دریا میں بہتا جارہا ہے۔ میں نے اس کتاب کو شروع سے اخیر تک پڑھا اور ایک رواں کتاب کی حیثیت سے اس کو پسند کیا۔ ممکن تھا کہ یہ کتاب تاریخ کی حیثیت سے اس سے زیادہ بلند پایہ پر لکھی جاسکتی تھی، لیکن یہ ناممکن تھا کہ کوئی نامسلم اس سے زیادہ خلوص وعقیدت کی نذر دربار رسالت میں پیش کرسکتا اور یہی اس کتاب کی بہترین خصوصیت ہے''۔[ص:۱۴]

معروف ادیب وانشاپرداز مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اخبار ''ہمدرد'' دہلی میں اس کتاب پر ریویو شائع کیا تھا، جس میں آپ تحریر کرتے ہیں: ''رسول عربی'' اس مختصر وجامع رسالہ کا نام ہے، جو دارا صاحب کے تخم محبت کا ثمر اولین ہے، اس میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات حیاتِ مبارکہ شروع سے آخر تک اس انداز سے جمع کردیے گئے ہیں کہ اکثر مقامات پر ایک مسلمان کو بھی اس خلوصِ نیاز پر رشک آنے لگتا ہے''۔

(جاری)

☆☆☆☆☆

تاریخ وتذکرہ

بی اماں - ایک فراموش شدہ ملی قائد

نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی

وطن عزیز کو برطانوی قبضے سے آزاد کرانے میں مسلمانوں خصوصاً علمائے کرام نے جس جذبے، ولولے اور جوش وخروش سے حصہ لیا، وہ بلاشبہ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ ان لائق صد فخر علمائے کرام کی برپا کی ہوئی تحریک خلافت ہی نے غاصب انگریزوں کو مجبور کیا کہ وہ اس ملک کو اپنے ناجائز قبضے سے آزاد کریں۔

تحریک خلافت نے اسلامیانِ ہند کو اتنی ہمت اور حوصلہ بخشا کہ وہ اپنے باہمی اختلافات بھلا کر حصول آزادی کے لیے متحد ہو جائیں۔ شمع آزادی کے ان پروانوں کے دوش بہ دوش مسلم خواتین بھی تھیں، لیکن بدقسمتی سے تحریک خلافت اور جدو جہد آزادی کی تاریخ میں ان کے نام اور ان کی خدمات کو یا تو فراموش کر دیا گیا یا پھر سرسری طور پر ان کا تذکرہ آیا ہے۔ ان فراموش شدہ خواتین اسلام میں سے ایک اہم نام 'بی اماں' کا بھی ہے۔ حالاں کہ اس خدارسیدہ خاتون کی حیات اور خدمات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے کارنامے اس درجے کے ہیں کہ ان کو ''مادرِ ملت'' کا لقب دینا چاہیے اور ان کی شایان شان یادگار قائم کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

بیسویں صدی مسیحی کی دوسری اور تیسری دہائی میں ملک کے ملی وقومی مطلع پر روشن ہونے والی اس خاتون کا اصل نام آبادی بانو بیگم تھا، لیکن 'بی اماں' کے نام سے ملک کے طول وعرض میں مشہور ہوئیں۔ ان کی ولادت ۱۸۵۲ء کے آس پاس امروہہ کے ایک باحمیت اور غیرت مند مسلم گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد ماجد کا نام مظفر علی خاں تھا۔ وہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے نام ور جاں باز و مجاہد تھے۔ شوہر کا نام عبدالعلی خاں تھا۔ ان کا انتقال ۱۷/رمضان ۱۲۹۷ھ مطابق ۲/اگست ۱۸۸۰ء کو ہوا۔ اس طرح بی اماں محض ۲۷، ۲۸/برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ اولاد میں پانچ صاحب زادے اور ایک صاحب زادی تھیں۔ دو صاحب زادے مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر بہت مشہور ہوئے۔

بی اماں انتہائی پردہ نشیں خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنی اولاد کو علم، ادب اور تہذیب کی دولت سے مالا مال کیا۔ اگرچہ اس سلسلے میں ان کو مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنے پاکیزہ ارادوں پر قائم رہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے لخت جگر اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ملک وملت کی خدمت کریں۔ انہوں نے اپنی جوانی کے زمانے میں حج کے موقع پر غلاف کعبہ پکڑ کر اپنی اولاد کے حق میں یہ دعا نہیں کی تھی کہ انہیں دنیوی شان و شوکت اور اعلیٰ مراتب ومناصب حاصل ہوں بلکہ انہوں نے رب کعبہ سے یہ دعا کی تھی: ''اے پروردگار! میری اولاد کو دین کا سچا خادم اور پختہ مومن بنا دے''۔ رب کعبہ نے درِ کعبہ پر کھڑی اس نیک طینت سائلہ کو مایوس نہیں کیا اور مولانا محمد علی جوہر کی صورت میں اسلامیان ہند کو ایک ایسا زعیم عنایت کیا جو اعلیٰ مومنانہ اور مجاہدانہ صفات سے متصف ہونے کی وجہ سے اپنے ہم عصروں میں بہت ممتاز تھا۔

بی اماں میں ملی غیرت، ایمانی حرارت، دینی حمیت، اسلامی حمایت اور مسلمانوں سے محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ نہایت عبادت گزار، نماز روزے خصوصاً نماز تہجد کی بہت پابند تھیں۔ ان کی نماز فجر سفروں کی کثرت اور رات کی تقریروں اور جلسوں میں شرکت کے باوجود پچاس برس کی مدت میں کبھی قضا نہیں ہوئی۔ تحریک خلافت کے سنہرے دور میں بی اماں خود بھی شعلہ جوالہ بن کر رہیں۔ انہوں نے گرمی محفل کو برقرار رکھنے کے لیے دور دراز کے پُر مشقت اور پُر صعوبت سفر کیے۔ ان سفروں میں وہ اسلام اور اسلامی خلافت کی حمایت وتایید میں نہایت مؤثر اور دل آویز تقریریں کرتی تھیں۔

بی اماں نے ۳۰/دسمبر ۱۹۱۷ء کو کلکتہ کے اجلاس مسلم لیگ میں جو پیغام دیا وہ تاریخ دعوت و عزیمت میں جلی حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس پیغام کی ایک ایک سطر سے عزم، ہمت، جوش، ولولہ اور استقلال واستقامت کی داستانیں ترتیب دی جاسکتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں:

''یہ پیغام نہ میری ذات سے وابستہ ہے اور نہ اسلام کے ان دو خادموں کی ذات سے جن کو خدا نے امانتاً میرے سپرد کیا ہے اور جنہوں نے میری گود میں پرورش پائی...... اگرچہ اس ضعیف اور سن رسیدہ سی عورت کا جسم خاکی اب فرسودہ اور کم زور ہو گیا ہے لیکن دل اور دل کے اندر اتنا کم

زور نہیں کہ شوکت علی اور محمد علی کو وہ جادہ حق سے ایک قدم باہر جانے کی اجازت دے دے۔ اس سے قبل کہ وہ صراط مستقیم سے ہٹ سکیں، انہی ضعیف ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ دوں گی۔ آج اس جگہ اپنے ہندو بھائیوں اور عزیزوں کو دیکھ کر میرے دل میں باوجود غم کے خوشی کی لہر اٹھتی ہے مگر وہ لہر شکوہ وشکایت کی آمیزش سے پاک ہے"۔ ["شنیدہ ودیدہ"، از پروفیسر اختر الواسع]

انہوں نے ممبئی میں ۱۹۲۱ء میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشانی کے عالم میں ہیں۔ اس لیے ضرورت اس کی ہے کہ دونوں متحد رہیں، کھدر پہنیں اور تمام دن کپڑا بنیں ......اور ملک کے مفاد کی خاطر دونوں کا اتحاد ضروری ہے۔......آخر تم کھدر کیوں نہیں پہنتے؟ کیا میں پہلے مہین کپڑے نہیں پہنتی تھی؟ کیا میں اب اس کھدر کو موٹا جھوٹا نہیں پاتی؟ کیا زمانہ قدیم میں ہندو کھدر نہیں پہنتے تھے؟ کیا پیغمبر نے کھدر نہیں پہنا؟ اس لیے میرے بھائیو! میری خواہش ہے کہ تم سیدھے راستے پر چلو اور ملک کے سپاہی بن جاؤ، دلیر بن جاؤ، خدا تمہیں عزت بخشے"۔ [حوالہ مذکور]

گاندھی جی نے "ینگ انڈیا" میں ان کی استقامت اور استقلال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

"اگرچہ سن رسیدہ تھی لیکن ان میں نوجوان جیسی طاقت تھی۔ انہوں نے خلافت اور سوراجیہ کے حصول کے لیے مسلسل سفر کیے۔ وہ اسلام کی کٹر پیرو تھیں اور اس کے کاز کو ہندوستان کی آزادی پر منحصر سمجھتی تھیں۔ اور ہندوستان کی آزادی ان کے نزدیک کھدر اور ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ناممکن تھی۔ اسی لیے انہوں نے اتحاد کے لیے زبردست کوششیں کیں جو ان کے نزدیک جزو ایمان تھیں"۔ [حوالہ مذکور]

نومبر ۱۹۲۱ء میں بی اماں کے جگر پاروں اور مسلمانان ہند کے محبوب قائدین مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر کو کراچی میں حکومت مخالف تقریر کرنے کے جرم میں ۲/برس کی سزا ہوئی۔ اس وقت بی اماں کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہوئی یہ نظم "صدائے خاتون" کے نام سے بہت مشہور ہوئی۔ اس نظم کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں:

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا
کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا
پورے اس امتحاں میں اترنا
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے
کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
ہیں یہی دین احمد کے رستے
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
حشر میں حشر برپا کروں گی
پیش حق تم کو لے کر چلوں گی
اس حکومت پہ دعویٰ کروں گی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر جب چھندواڑے کے قید خانے میں بند تھے، اس وقت یہ خبر مشہور ہوئی کہ حکومت کسی ذریعے سے معافی نامے کا ایک مسودہ دونوں بھائیوں کے پاس بھیج کر ان کے دست خط کرانا چاہتی ہے۔ بی اماں کو جب یہ اطلاع ملی تو انہوں نے اپنے جگر پاروں کے پاس کہلا بھیجا کہ: "اگر کسی بھی معافی نامے پر دست خط کا تم لوگوں نے ارادہ کیا تو قبل اس کے کہ دست خط کر سکو اپنے ان ہی بوڑھے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دوں گی"۔ اس شیر دل ماں کی اولاد اگر شیر نہ ہوتی تو کیا ہوتی؟

بی اماں نے اپنے اخلاص، عزم، حوصلے، استقلال، کردار اور عمل پیہم سے اپنے نام ور فرزندوں کی رگ و پے میں بجلیاں بھر دی تھیں۔

مادر محترم کی اس تربیت کا اثر تھا کہ ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس لندن میں برطانیہ کے بادشاہ کے روبرو رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر نے کلمہ حق کہا اور بہترین جہاد کیا۔

مولانا محمد علی نے اپنی والدہ ماجدہ کے لیے لکھا ہے: "میں جو کچھ ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ خداوند کریم نے مجھے اسی مرحومہ کے ذریعے سے پہنچایا ہے"۔

۱۲، ۱۳/نومبر ۱۹۲۴ء بدھ، جمعرات کے درمیانی شب میں تقریباً ۷۲/برس کی عمر میں اس بزرگ خاتون کا انتقال ہوا اور درگاہ شاہ ابوالخیر، دہلی میں دفن ہوئیں۔

گاندھی جی نے ان کے انتقال پر یہ بیان دیا:
"یہ تصور کرنا بڑا کٹھن ہے کہ بی اماں کا انتقال ہو گیا ہے۔ کون بی اماں کی باوقار شخصیت اور عوامی اجتماعات میں ان کی آواز کی گونج سے ناواقف ہے......وہ بدیشی کپڑا ترک کر چکی تھیں اور مولانا محمد علی کہتے ہیں کہ انہوں نے وصیت کی تھی کہ مرتے وقت انہیں کھدر میں دفنایا جائے

جب کبھی میں ان کے بستر علالت تک گیا تو انہوں نے ہمیشہ سوراج اور اتحاد ہی کی بابت معلوم کیا۔

یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں موت کی رات ان کے قریب ہی تھا میں اور سروجنی دیوی فوراً پہنچ گئے تھے۔ ڈاکٹر انصاری ان کے معالج تھے۔ مولانا محمد علی رو رہے تھے۔ مگر شوکت علی خاموش تھے وہ بہت ضبط کر رہے تھے۔ اور اللہ کا نام لے رہے تھے۔ 'کامریڈ' کا پریس بی اماں کے کمرے کے قریب تھا لیکن وہاں کام ایک لمحے کے لیے نہیں رکا، نہ ہی مولانا نے اپنے مدیرانہ فرائض سے غفلت برتی''۔[حوالہ مذکور]

انڈین نیشنل کانگریس کی سابق صدر مسز اینی بیسنٹ نے بی اماں کو اپنے ایک تعزیتی پیغام میں یوں یاد کیا:

''میں خراج عقیدت پیش کرنے میں خود کو دوسروں کے ساتھ شریک کرتی ہوں۔ اسی شیر دل اور انتہائی مذہبی قابل احترام خاتون کے تئیں جو کسی خطرے سے خوف زدہ نہیں ہوئی اور جس نے اس دھرتی پر کسی چیز کو اپنے عقیدے پر فوقیت نہیں دی۔ ایسی روحیں دوسروں کو بھی باوقار بناتی اور مثال پیش کرتی ہیں۔ وہ آزادی کی راہوں کو منور کرتی ہیں اور ہموار بناتی ہیں۔ اپنے خون بہتے ہوئے پاؤں سے جس پر قوم چلتی ہیں انہیں ابدی روشنی میسر ہو''۔[حوالہ مذکور]

مادر ملت بی اماں کے قول و فعل، کردار اور عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدائے رحمٰن و رحیم کی بندیاں، رحمۃ للعالمینؐ کی باندیاں، امہات المومنین اور بنات طاہرات کے ناموں پر مر مٹنے والیاں اس دور ظلمت میں بھی پیدا ہوسکتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

.... بقیہ صفحہ ۲۶؍ کا

.... یہ مدراس کے چیف قاضی تھے، آپ اردو کے اولین سیرت نگار قاضی بدر الدولہ کے پوتے اور ڈاکٹر صاحب کے تایا زاد بھائی تھے، زہد و تقوی کی ایسی مثالیں اب شاید ہی دیکھنے کو ملیں، اس خانوادے میں گزشتہ پچیس پشتوں سے علم و قضاء چلا آرہا ہے، شہنشاہ جہانگیر سے ابتک کے بادشاہوں اور فرمارواؤں کے فرامین اس خاندان میں محفوظ چلے آرہے ہیں، اس خانوادے کا کتب خانہ سعیدیہ حیدر آباد اور کتب خانہ محمدیہ مدراس دنیا کے بڑے قلمی کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے، اور اتنی نسلوں تک جاری ایسے کسی اور علمی خانوادے کی دوسری مثال برصغیر میں شاید ہی ملے۔

مولانا ابوالجلال ندوی نے سید سلطان بھمی اور نذیر احمد شاکر کے ساتھ روزنامہ مسلمان ۱۹۲۷ء میں جاری کیا تھا، اس پر نوے سال گزر چکے ہیں، اور آج بھی جاری و ساری ہے، یہ اس وقت اردو زبان کا سب سے قدیم اخبار ہے، اور پوری دنیا میں ہاتھ کی کتابت سے جاری واحد اخبار مصنف نے مونٹ روڈ پر واقع دربار ہوٹل کا تذکرہ کیا ہے، اس زمانے میں ہمارے بھٹکل کے تاجروں کی ہوٹل اور مدراسی لنگیوں کے کاروبار میں بڑی دھاک تھی، چونکہ یہ حضرات اردو سلاست سے بولتے تھے، تو مدراس، کیرالا، آندھرا وغیرہ میں شمالی ہند سے آنے والے اہل علم ان سے جلد مانوس ہوتے اور اپنائیت محسوس کرتے تھے، ان کے ہوٹل ان کے بیٹھنے اٹھنے کے مرکز ہوا کرتے تھے، دربار ہوٹل جہاں واقع تھا، یہاں سے مدراس میں اردو بولنے والوں کا علاقہ ٹرپلیکن شروع ہوتا تھا، 'مسلمان' اخبار کا دفتر قریب ہی میں واقع تھا، ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے خانوادے کا دیوان باغ، شاہی والا جاہی مسجد، شاہی محل وغیرہ یہیں اڑوس پڑوس میں واقع تھے، لہٰذا ہمارا گمان غالب ہے کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ سے آپ کا تعارف ابتدائی زمانے ہی کا ہے۔

سیٹھ یعقوب حسن جن کا ذکر کتاب میں آیا ہے، اصل ناگپور کے تھے، لیکن مدراس میں ان کا کاروبار تھا، مسلم لیگ کے ابتدائی لوگوں میں تھے، آزادی سے قبل پہلی مقامی کیبینٹ میں راج گوپال اچاریہ جی کی وزارت علیا کے دور میں وزیر بھی رہے، اپنی کتاب 'الہدیٰ' کی وجہ سے بھی پڑھے لکھے حلقہ میں معروف رہے، جمالیہ کے پڑوس ہی میں ان کی کوٹھی تھی، 'الہدیٰ' کی تصنیف میں مولانا ابوالجلال ندوی کا بھی بڑا حصہ تھا، اس کا بہت ہی اعلیٰ اور بھاری بھرکم ایڈیشن آج بھی ہماری نظروں کے سامنے ہے۔

آخر میں یہ تذکرہ کہ جمالیہ اور جمال محمد کی اولاد جمال محی الدین وغیرہ کے مکانات کی قطار کے درمیان جو میدان تھا وہیں پر متحدہ ہندوستان میں جماعت اسلامی کا آخری اجتماع ہوا تھا، بانی جماعت کا آخری دردمندانہ اور تاریخی خطاب یہیں ہوا تھا۔

احمد حاطب صدیقی نے اپنی اس کتاب کے ذریعہ بھولی بسری اپنے دور کی ایک عبقری شخصیت کو نئی زندگی دی ہے، اللہ تعالیٰ ان کے قلم میں اور برکت دے، ان کے تر و تازہ تحریروں سے اسی طرح فراموش شدہ شخصیات زندگی پاتی رہیں تو اس سے فرض کفایہ تو ضرور ادا ہوگا۔

☆☆☆☆☆

فقہ وفتاویٰ

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی

سوال: غیر مسلموں سے مسلمانوں کبھی کاروباری اور کبھی سیاسی معاملہ رہتا ہے، اس قسم کی مصلحتوں کے پیش نظر اگر ان کو شادی بیاہ اور مختلف قسم کے پروگراموں میں دعوت دی جائے تو شرعاً اس کی اجازت ہے یا نہیں؟

جواب: اسلامی تعلیمات کی رو سے غیر مسلموں کو دعوت دینا اور اس کو اپنے پروگراموں میں شامل کرنا جائز ہی نہیں بلکہ بہتر ہے، اگر نیت یہ ہو کہ اس طرح وہ اسلام سے مانوس ہوں گے، اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو کم از کم اسلام اور مسلمانوں کے سلسلہ میں ان کا رویہ نرم ہوگا تو ان کو دعوت دینا باعث اجر وثواب بھی ہوگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس بات کا حکم دیا گیا کہ آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی طرف بلائیں جیسا کہ آیت کریمہ میں ہے: "أَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الأَقْرَبِيْنَ" تو آپ نے بنو ہاشم کو جمع فرمایا اور ان کے لیے کھانے کا اہتمام بھی فرمایا۔

[الدر المنثور: ج۵/ص۱۸۱]

اس سے معلوم ہوا کہ اچھی نیت سے اگر غیر مسلموں کو مدعو کیا جائے تو یہ باعث ثواب اور اتباع سنت نبویؐ ہے۔

سوال: اگر کوئی شخص فاسق وفاجر اور کھلے عام گناہ کرتا ہو، اس کی طرف سے دعوت آجائے تو اس کو قبول کرنا کیسا ہے؟ اس کی دعوت میں شرکت کرنے سے گناہ تو نہیں ہوگا؟

جواب: فاسق کی دعوت سے متعلق تفصیلات ہیں، اگر ان کی دعوت قبول کرنے اور اس میں شرکت سے اس کی اصلاح کی امید ہو یا شرکت نہ کرنے میں ضرر کا اندیشہ ہو تو اصلاح کی امید یا ضرر سے تحفظ کی خاطر شرکت کی گنجائش ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو جو شخص علی الاعلان فاسق ہو تو اس کی دعوت قبول کرنے سے منع کیا گیا ہے، فتاویٰ ہندیہ میں ہے:" لايجيب دعوة الفاسق المعلن ليعلم أنه غير راض بفسقه"۔ [ج۵/ص۵۴۱] کھلے ہوئے فاسق کی دعوت قبول نہ کی جائے تا کہ اسے معلوم ہوجائے کہ مرے فسق سے وہ راضی نہیں ہیں)۔

سوال: ایک شخص نے قسم کھائی کہ میں فلاں دوست کی کوئی چیز نہیں کھاؤں گا، بعد میں دوست نے ایک عمدہ کھانے کی چیز ہبہ کردی، اس نے ہبہ شدہ چیز اپنی ملک سمجھ کر کھالی تو کیا اس صورت میں وہ حانث ہوجائے گا اور قسم کا کفارہ دینا پڑے گا؟

جواب: جب دوست کی کسی چیز نہ کھانے کی قسم کھائی تو اب کھالینے سے وہ حانث ہوجائے گا، خواہ اسے ہبہ ہی کیوں نہ کردیا گیا ہو، کیونکہ عرف ورواج میں اس قسم کی چیز دینے والے ہی کی چیز سمجھی جاتی ہے اور یہ صورت یہاں موجود ہے، اس لیے کفارہ دینا لازم ہے۔ [فتاویٰ ہندیہ: ج۲/ص۸۳]

سوال: ایک شخص نے قسم کھائی تھی کہ اپنے بھائی کی کوئی چیز نہیں لوں گا، ایک چیز کی ضرورت پڑگئی اور اس نے بطور قرض بھائی سے وہ چیز لے لی تو اس صورت میں کیا وہ حانث ہوجائے گا، اور کیا کفارہ ادا کرنا ہوگا؟

جواب: قرض لینے کی صورت میں انسان اس چیز کا مالک ہوجاتا ہے، اس لیے اس میں وہ حانث نہیں ہوگا اور نہ کفارہ دینا ہوگا۔[حوالہ سابق]

سوال: ایک شخص نے نذر مانی تھی کہ میرا بچہ اگر بیماری سے صحت یاب ہوگیا تو میں ایک کوئنٹل گیہوں صدقہ کروں گا، اب وہ بچہ ماشاء اللہ صحت یاب ہوگیا، اب وہ چاہتا ہے کہ گیہوں کے بجائے روپے صدقہ کردے تو اس کی اجازت ہوگی؟

جواب: گیہوں یا اس کی قیمت دونوں میں کوئی بھی صدقہ کردے تو نذر ادا ہوجائے گی، فتاویٰ قاضی خاں میں اس قسم کے واقعہ میں جواز کی صراحت موجود ہے۔ [فتاویٰ قاضی خاں: ج۱/ص۱۶۹]

سوال: اگر کوئی اپنے لڑکے پر غصہ ہوکر کہے کہ تیری کمائی میرے لیے حرام ہے اور مرنے کے بعد تم میری قبر پر مٹی نہ ڈالنا، اب اگر وہ شخص اپنے بیٹے کی کمائی کھانا چاہے تو کیا صورت ہوگی؟ اور بیٹا باپ کی وفات کے بعد کفن دفن میں شریک ہو تو کیا اس کی اجازت ہوگی؟

جواب: اگر کوئی شخص کوئی حلال چیز اپنے اوپر حرام کرلے تو اس کے حرام کرنے سے وہ چیز حرام نہیں ہوگی بلکہ اس کا استعمال اسی طرح جائز اور حلال رہے گا، البتہ قسم کھانے کی وجہ سے قسم توڑنے پر کفارہ لازم ہوگا، لہٰذا باپ بیٹے کی کمائی کھائے اور کفارہ ادا کرے، اور بیٹا کفن دفن میں شریک ہو، شرعاً اس کی اجازت ہی نہیں بلکہ تاکید وہدایت ہے۔

[شرح التنویر: ج۳/ص۶۳]

☆☆☆☆☆

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

باسمہٖ تعالیٰ

Date 10 January 2022

تاریخ ۱۰؍جنوری ۲۰۲۲ء

اپیل برائے تعمیر اسٹاف کوارٹرس

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ ناظم ندوۃ العلماء کی سرپرستی میں اپنی علمی و دینی خدمت میں مصروف ہے، دارالعلوم اور اس کی شاخوں میں علمی و تعلیمی امور حسب معمول جاری ہیں، اساتذہ و کارکنان ندوۃ العلماء اپنی ذمہ داریوں کو انجام دے رہے ہیں۔ اساتذہ و اسٹاف کی کثرت کی وجہ سے دارالعلوم میں ان کی رہائش کی مزید گنجائش نہیں رہی تو احاطۂ دارالعلوم کے علاوہ معہد دارالعلوم ندوۃ العلماء (سکروری) میں اسٹاف کوارٹرس اور معہد سے قریب مستقل طور پر ندوہ کالونی کی سہ منزلہ عمارت تعمیر ہوئی، مگر اب بھی اسٹاف کے لیے کوارٹرس کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر ندوہ کیمپس سے متصل محلّہ مکارم نگر میں مزید اسٹاف کوارٹرس تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مدد کے بھروسہ پر یہ تعمیر شروع کرادی گئی ہے۔

جدید اسٹاف کوارٹرس کی زیر تعمیر یہ عمارت تین منزلہ ہوگی، جس میں ۹ فیملی کوارٹرس ہوں گے، اس کی تعمیر پر مبلغ 1,15,00,000/- (ایک کروڑ، پندرہ لاکھ روپئے) کے خرچ کا تخمینہ ہے جو ان شاء اللہ اہل خیر حضرات کے تعاون سے پورا ہوگا۔

ہم امید کرتے ہیں کہ آپ اس اہم ضرورت کی طرف فوری توجہ فرمائیں گے اور ندوۃ العلماء کے کارکنوں کا ہاتھ بٹائیں گے۔

ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورا بھروسہ ہے کہ اس کی مدد سے یہ اہم کام تکمیل کو پہنچے گا، وما ذلك على الله بعزيز.

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(پروفیسر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) سید بلال عبدالحی حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA
STATE BANK OF INDIA MAIN BRANCH, LUCKNOW
(IFSC CODE : SBIN0000125)

تعمیرات

A/c. No. 1086 3759 733

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:
NADWATUL ULAMA
اور اس پتہ پر ارسال کریں
NIZAMAT NADWATUL ULAMA
Nizamat Office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marg, Lukcnow - 226007 (U.P.)
معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر
+91 - 7275265518
پر مطلع فرمانے زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔
فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا